سلسلہ وار استحکام پاکستان (۳)

...اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور پاکستان

وقد اخذ ميثاقكم ان كنتم مؤمنين

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

PEPSI

MIRINDA

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۴ / ۳۹۳۱

ا

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۵

شمارہ ۴

اپریل ۱۹۸۶ء

بمطابق

شعبان المعظم ۱۴۰۶ھ

زرِ سالانہ ۴۰ روپے

فی شمارہ -/۴ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

- اعلان سالانہ اجتماع تنظیم اسلامی ۳
- تذکرہ و تبصرہ ——— ڈاکٹر اسرار احمد ۵
  - دینی جماعتوں کا سیاسی اتحاد ——— یا
    ایک متحدہ مذہبی محاذ کا قیام
  - پاکستان کی اراضی اور انفرادی ملکیت
  - ایک ناخوشگوار وضاحت
- استحکام پاکستان (۴) ——— ڈاکٹر اسرار احمد ۱۷
  - تصویر کا روشن رُخ
  - اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور پاکستان
  - خلاصۂ مباحث
- آیۂ اظہارِ دین اور شاہ ولی اللہؒ ۸۲
- شیخ الہندؒ کی عظمت کے عناصرِ ترکیبی ——— ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ۸۹
- مولانا مودودی اور مسئلہ بیعت ——— ڈاکٹر اسرار احمد ۹۵
- مدحِ عمرؓ بزبانِ صدیق اکبرؓ ——— حمید فضلی ۱۰۱
- 'الامام المہدی' ——— ——— ڈاکٹر اسرار احمد ۱۰۵
- ایک اہم خط اور تعلیم نبویؐ کا اہم موتی ——— مولانا محی الدین لکھوی ۱۰۹

تنظیمِ اسلامی کے گیارہویں سالانہ اجتماع

جمعہ ۴ تا اتوار ۶ اپریل ۱۹۸۶ء

بمقام: ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

کے ضمن میں قیّم تنظیمِ اسلامی چوہدری غلام محمد صاحب کا

رفقاءِ تنظیم کے نام پیغام:

اِس اجتماع میں تمام رفقائے تنظیم اسلامی کی ہمہ وقت شرکت لازمی ہے۔ لہٰذا آپ بھی اِس کا اہتمام فرمائیں۔ اور اگر آپ کسی شدید عذر کی بناء پر شرکت سے معذور ہوں تو تفصیلی معذرت ارسال فرمائیں۔

پہلی باقاعدہ نشست اگرچہ ۴ اپریل بروز جمعتہ المبارک بعد نماز مغرب شروع ہوگی تاہم رفقاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ قبل از نماز جمعہ قرآن اکیڈمی پہنچ جائیں یا نماز جمعہ مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں ادا کریں۔ سالانہ اجتماع کی آخری نشست ۶ اپریل بروز اتوار قبل از نماز ظہر اختتام پذیر ہوگی تاہم شام کو انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ اجلاس میں رفقاء کی شرکت پسندیدہ ہوگی۔ اجتماع کے دوران تمام رفقاء کی رہائش قرآن اکیڈمی میں ہوگی۔ اس کے لیے حتی الوسع ضروری انتظامات کیے جائیں گے تاہم موسم کے مطابق بستر اور ذاتی استعمال کے برتن آپ ساتھ لائیں۔ جمعہ ۴ اپریل کو صبح سات بجے سے دوپہر بارہ بجے تک لاہور ریلوے سٹیشن پر تنظیم کی جانب سے استقبالیہ کیمپ لگا ہوگا اور اس عرصے کے دوران وہاں پہنچ جانے والے حضرات کو ماڈل ٹاؤن پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔ بعد میں تشریف لانے والے حضرات کو مقام اجتماع پر خود ہی پہنچنا ہوگا۔

(احقر غلام محمد)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱- دینی جماعتوں کا سیاسی اتحاد ــ یا
ایک مُتّحدہ مذہبی محاذ کا قیام

جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے لاہور کے ۶ مارچ کے جلسۂ عام میں مذہبی مزاج کی حامل جملہ سیاسی جماعتوں کو اتحاد اور اشتراکِ عمل کی دعوت دی ہے۔ جو بظاہر تو نہایت مبارک اور خوش آئند ہے لیکن اوّل تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کام فی نفسہٖ بہت مشکل ہے۔ دوسرے خود میاں صاحب نے اس ضمن میں "جماعتِ اسلامی کے ساتھ مل کر کام کریں" کے الفاظ کے ذریعہ جماعتِ اسلامی کی اوّلیت اور بقیہ سب کی ثانویت کو نمایاں کر کے گویا اس دعوت پر لبیک کہنے کے دروازے خود بند کر دیئے ہیں۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمٰن کی جانب سے تو بالواسطہ طور پر انکار فوری طور پر یعنی اگلے ہی روز ۷ مارچ کے پشاور کے جلسۂ عام میں آچکا ہے۔

میاں صاحب کی حالیہ دعوتِ اتحاد کی مخاطب تو صرف وہ جماعتیں یا جمعیتیں ہیں جو سیاسی اہمیت کی حامل بھی ہیں اور انتخابات میں حصّہ لینے کی پالیسی پر عامل بھی، مزید برآں انہوں نے ان کے نام بھی معیّن کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اس دعوت کے ضمن میں تو راقم الحروف اور تنظیم اسلامی خارج از بحث ہیں تاہم اب سے لگ بھگ چار سال قبل جناح ہال لاہور میں منعقدہ "تعلیم القرآن کانفرنس" میں میاں صاحب نے جو دعوتِ عام دی تھی کہ "ہمیں چاہیئے کہ قرآن کی اساس پر جمع ہو جائیں!" تو اس کے ضمن میں راقم نے میاں صاحب سے دریافت کیا تھا کہ:

"...... آپ کے پاس اس اتحاد کے لئے تفصیلی پروگرام کیا ہے؟ اور آیا اس سے مراد (کالعدم) جماعت اسلامی میں شمولیت کی دعوت ہے یا یہ کسی وسیع تر دینی اتحاد کی پیشکش ہے؟ اور اگر یہ وسیع تر دینی اتحاد کی دعوت ہے تو بالفرض اگر میں آپ کی اس پکار پر لبیک کہوں تو ایک طرف مجھے کیا تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور آپ کی مجھ سے توقعات کیا ہونگی!

اور دوسری طرف اس مجوزہ 'تعاون علی البر و التقوٰی' کے ضمن میں اشتراکِ عمل کے لئے کونسا میدانِ کار آپ کے سامنے ہے ؟"

اس کے بعد راقم الحروف نے جماعتِ اسلامی کے موجودہ طریقِ کار سے اپنے اختلاف کو تفصیلاً معین کرتے ہوئے لکھا تھا :

"تاہم اس سب کے باوجود ـــــ اگر کسی وسیع تر دینی اتحاد و اشتراکِ عمل کا کوئی واضح پروگرام آپ کے سامنے ہو تو ان شاء اللہ العزیز آپ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس ضمن میں 'انا اوّل المسلمین' کی سی شان کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے پائیں گے۔"

(شائع شدہ 'میثاق' جولائی ۸۲ء)

اس کا جو جواب میاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا تھا اس کے آخری الفاظ، گویا لبِّ لباب یہ تھا کہ :ـ

"...... جب تک طریقِ کار اور حکمتِ عملی پر اتفاق نہ ہو جائے دین کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اپنے طریقِ کار اور پالیسی کے مطابق اقامتِ دین کا مثبت کام کیا جائے۔ اور کسی دوسرے کے کام کو پبلک پلیٹ فارم پر یا پریس میں ہدف ملامت و نکتہ چینی نہ بنایا جائے۔"

بنابریں حالیہ 'دعوتِ اتحاد' کے ضمن میں میاں صاحب سے مخاطب ہونے کی جرأت میرے لئے نہ ضروری ہے نہ مناسب،

تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "الدین النصیحۃ" پر عمل کرتے ہوئے حسبِ ذیل گذارشات میاں صاحب سمیت جملہ خادمانِ دین اور اکابرِ ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں پیش ہیں :

۱۔ فیڈریشن یا کنفیڈریشن یعنی مرکز اور صوبوں کے مابین ذمہ داریوں اور اختیارات کی تقسیم کا معاملہ ہو یا صوبوں کی از سرِ نو تشکیل یا تقسیم کا معاملہ ـــــ اسی طرح خواہ علاقائی قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہو خواہ علاقائی زبانوں کے تحفظ کا معاملہ ـــــ یہ جملہ امور خالص سیاسی ہیں اور ان کا دین کے ساتھ تعلق صرف بالواسطہ اور ثانوی ہے، براہ راست نہیں، لہٰذا ان کی اساس پر کسی سیاسی اتحاد کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن انہیں کسی دینی اتحاد کی اساس بنانا خود دین و مذہب کی مصلحت کی رُو سے درست نہیں ہے۔

۲ ۔ البتہ اسلامی نظام کے قیام یا نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ اور شریعتِ اسلامی کی کلّی اور ہمہ گیر تنفیذ کو ایک دینی اتحاد کی مثبت اساس بنایا جائے تو یہ نہایت مستحسن اقدام ہوگا ۔ اور اس میں کم از کم اُن جملہ جماعتوں کی شرکت و شمولیت معقول بھی ہوگی اور مطلوب بھی جو اس مقصد کے حصول کے لئے جمہوری اور انتخابی طریق کو درست اور مناسب سمجھتی ہیں ـــــ اور اگرچہ خود راقم الحروف اور اس کی قائم کردہ 'تنظیم اسلامی' کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ مقصد انتخابات کے راستے سے نہیں بلکہ صرف 'انقلاب' کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے ـــــ تاہم اگر ایسا کوئی اتحاد ممکن العمل ہو تو اس کے ضمن میں ہم نہ صرف دعاگو رہیں گے بلکہ بالواسطہ طور پر اسے ہر ممکن طریقے سے تقویت بھی پہنچائیں گے ـــــ البتہ راقم کے نزدیک ان جماعتوں کا اس قسم کے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جانا جو انتخابات کے میدان میں خود ایک دوسرے کی حریف ہوں تقریباً ناممکن ہے ۔

۳ ۔ البتہ ایک دوسری سطح پر کوئی 'متحدہ مذہبی محاذ' یا 'تحفظ شریعت محاذ' قابلِ عمل بھی ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی ـــــ بلکہ اگر یہ عرض کیا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر وہ وجود میں نہ آیا تو یہ ایک اجتماعی جرم ہوگا جس کی ذمہ داری سے پوری موجودہ ملت اسلامیہ پاکستان اور بالخصوص اس کے دینی اکابر کبھی بری نہ ہو سکیں گے ـــــ اس ممکن العمل اتحاد کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اسلامی نظام کے قیام یا نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے طریق کار کے علاوہ خود اس نظام کی بعض تفصیلات و ترجیحات کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے ، مدافعانہ انداز میں شریعتِ اسلامی کی متفق علیہ تعلیمات اور اسلام کے مجمع علیہ شعائر کے تحفظ کے لئے جملہ دینی و مذہبی جماعتیں ، جمعیتیں اور تنظیمیں ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں ، قطع نظر اس سے کہ وہ سیاسی میدان میں بھی برسرکار ہوں یا خالص مذہبی و سماجی اور تبلیغی و تدریسی خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور عام اس سے کہ ریاست اور حکومت کی سطح پر بھی تبدیلی کی خواہاں جماعتیں انتخابی طریق پر عمل پیرا ہوں یا 'بزعم خویش' انقلابی طریق کو اختیار کئے ہوئے ہوں ۔

ہر صاحب درد مسلمان تسلیم کرے گا کہ ایسے متحدہ محاذ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اب تک ہوا یہ ہے کہ جملہ دینی جماعتیں تو اپنے اپنے طریق کار کے مطابق کل دین حق کی اقامت یا کامل نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے لئے کوشاں رہیں اور اس ضمن میں اپنے اپنے طریق کار پر عمل پیرا رہیں اور اپنے خیال کے مطابق آگے ہی کی جانب دیکھتی رہیں ۔

لیکن اس اثنا میں الحاد اور اباحیت نے ہمارے معاشرے میں بھرپور نقب لگالی۔ نتیجۃً احوالِ اجتماعیہ میں تو شریعت کے کلی نفاذ کے ضمن میں کوئی پیش قدمی نہ ہوئی تھی نہ ہوئی، اُلٹا لینے کے دینے پڑ گئے اور الحاد و اباحیت نے انکارِ حدیث اور استخفافِ سُنّت کی راہ سے احوالِ شخصیہ تک میں اثر و نفوذ حاصل کر لیا۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے ایک عجیب متضاد صورتحال ہے کہ بھارت میں تو مسلمانوں کے عائلی قوانین کے ضمن میں آج تک کسی مضبوط سے مضبوط حکومت کو بھی دخل اندازی کی جرأت نہ ہوئی اور حال ہی میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے ایک فیصلے کے خلاف مسلمانانِ بھارت کا ردِّ عمل اس شدّت سے ظاہر ہوا کہ راجیو گورنمنٹ کو گھٹنے ٹیکتے ہی بنی اور ادھر پاکستان میں وہ عائلی قوانین جنہیں ۱۹۶۱ء میں شیعہ، اور سُنّی، اہل حدیث اور حنفی، اور دیوبندی اور بریلوی جملہ مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے خلافِ شریعت قرار دیا تھا[1] وہ پورے پچیس برس سے باضابطہ نافذ ہیں اور سیکولر نقطۂ نظر کی حامل سیاسی جماعتوں پر مستزاد بے پردہ اور مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین و بیگمات اور ان کے ہم خیال اور سرپرست مفکّرین و دانشور اسلام کی سماجی قدروں کو تہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

بنا بریں میری ناچیز رائے میں ایک ایسے متحدہ مذہبی محاذ کا فوری قیام نہایت ضروری ہے جس کا انداز مدافعانہ ہو اور جس کا دائرہ عمل صرف چند متعیّن اور متفق علیہ امور تک محدود رہے۔ اور بالکل ایسے جیسے ایم آر ڈی (MRD) چند متعیّن اور متفقہ سیاسی مقاصد کے لئے قائم ہوئی تھی مجوّزہ مذہبی محاذ (MMM) بھی اپنے دائرہ کار کو چند معیّن امور تک محدود رکھے اور اس کے ضمن میں جملہ فیصلے بھی کثرتِ رائے سے نہیں بلکہ اتفاقِ رائے (Consensus) سے کئے جائیں اور بقیہ جملہ معاملات میں اس اتحاد یا محاذ میں شامل جماعتیں اور تنظیمیں 'We Agree To disagree' کے انداز میں آزادانہ موقف اور طرزِ عمل اور طریقِ کار اختیار کر سکیں۔

راقم نے اس متحدہ محاذ کے قیام کی یہ تجویز بعض اکابر کے سامنے رکھی تو انہوں نے اُسے سراہا، میری خواہش تھی کہ اسے منظرِ عام پر میں خود نہ لاؤں بلکہ اکابر ہی میں سے کوئی اہم شخصیت

---

[1] ان جملہ مکاتبِ فکر کے چودہ چوٹی کے علماء کا متفقہ بیان ماہنامہ حکمتِ قرآن، کی اسی ماہ کی اشاعت میں ہے۔ جو یقیناً ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کو لے کر اٹھے۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت نکلا جا رہا ہے اور اس کی جانب پوری توجہ نہیں دی جا رہی۔ لہٰذا اپنی اس تحریر کے ذریعے اس تجویز کو منظرِ عام پر لا کر میں اپنے آپ کو عنداللہ بَری سمجھوں گا' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دین کا درد رکھنے والی اور اس کے ساتھ نصح و اخلاص کا تعلق رکھنے والی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے سرکردہ حضرات کو اس تجویز کو روبعمل لانے کی جانب متوجہ فرما دے۔

آخر میں صرف اتنی گذارش اور ہے کہ اگر یہ تجویز اکابر کو قابلِ قبول ہو تو یہ عاجز و احقر اور اس کے تمام ساتھی ان شاء اللہ العزیز ایسے کسی متحدہ مذہبی محاذ کے ضمن میں چپراسیوں اور چوکیداروں کی خدمات سرانجام دینے کو بھی موجبِ سعادت سمجھیں گے۔

راقم الحروف نے اس تجویز پر مشتمل ایک مختصر بیان بھی اخبارات کو جاری کیا تھا۔ اردو اخبارات کے ساتھ ساتھ انگریزی اخبارات نے بھی اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور کی گیارہ مارچ کی اشاعت میں شائع شدہ خبر کا عکس شاملِ اشاعت ہے۔ اور روزنامہ ڈان، کراچی کی خبر حکمتِ قرآن میں ملاحظہ فرمائیں۔

The Pakistan Times, Tuesday, March 11, 1986.

'United religious front' to provide basis for alliance

BY A STAFF REPORTER

—DR. ISRAR

Dr. Israr Ahmad, Ameer, Tanzim-i-Islam, has underscored the need for forging United Religious Front (Mutthida Mazhabi Mahaz).

In a statement issued in Lahore on Monday, Dr. Israr Ahmad stressed that the proposed Mahaz should confine its activities to certain specified and agreed religious issues and suggested that all decisions be taken with a consensus as far as possible. He hoped that such a 'Mahaz' could form the basis of a bigger alliance of the religious parties in the future and might be an instrument in removing the misunderstandings which came to surface occasionally because of lack of communication among the leaders. He assured that he and his supporters would not seek any office and would deem it an honour and a privilege to offer any services asked for, if a 'Muttahida Mazhabi Mahaz' was formed.

Calling upon all the politico-religious, non-politico-religious and solely religious organi-

sations of Pakistan to wage a concerted struggle for safeguarding at least the "agreed religious issues and the basic tenets of Islam" the Ameer, Tanzim-i-Islami said: "experience so far has shown that it is not possible for rival political parties to unite on a positive political programme which may result in the victory of Islam-loving forces in elections and then enforce Islam in the country. This is the only reason why a significant progress could not be made towards the enforcement of Islam in Pakistan." Dr. Israr Ahmad added "Taking advantage of this sorry state of affairs, the modern educated persons, who were by and large deeply influenced by the Western ideologies, civilisation and culture, used rather, mis-used the name of Islam and deprived the Muslims of Pakistan even of the personal religious freedom which they had enjoyed under the British regime."

Dr. Israr Ahmad said that it would augur well and would be very encouraging if the politico-religious parties make a positive response to the unity call of Mian Tufail Muhammad for the sake of enforcing Islam in the country. "At the moment unity among the various parties, based on religion, for the safeguard of the Muslim Personal Law and Tenets of Islam is a must and the dire need of the time". Dr. Israr Ahmad said if this is ignored, the responsibility of the serious consequences will rest on the leaders of the religious parties.

Citing the example of the Indian Muslims, against whose united protest India's powerful Government had to yield and accept their religious demands, inspite of Indian Supreme Court Judgement, Dr. Israr Ahmad emphasised on the formation of a "Muttahida Mazhabi Mahaz."

۲۔ پاکستان کی اراضی اور انفرادی ملکیت

روزنامہ 'نوائے وقت' کے 'فقیر سرراہے' محترم وقار انبالوی مدظلہٗ نے ۳ مارچ ۸۶ء کی اشاعت میں ملکیت زمین سے متعلق راقم الحروف سے منسوب رائے پر چند اشکالات بشکل سوال پیش فرمائے ہیں۔ تو اگرچہ 'سرراہے' ایک فکاہی کالم سمجھا جاتا ہے اور فکاہی کالموں کی باتوں کو بالعموم سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا ـــــ تاہم اوّلاً اس بنا پر کہ 'فقیر سرراہے' میرے علم کی حد تک پاکستان کے معمّر ترین صحافی ہیں اور اس اعتبار سے ادب و احترام کے مستحق ہیں اور راقم نہ صرف ان کی ہفت زبانی کا دل سے معترف ہے بلکہ ان کی یہ بات تو بہت ہی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے زمانے کے عمومی

رنگ بدل جانے کے باوجود اپنے کلام کو تا حال ابتذال سے بچایا ہوا ہے اور مولانا چراغ حسن حسرت اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کے ذوق و معیار کو برقرار رکھا ہوا ہے ـــــ ثانیاً اس بنا پر کہ انہوں نے بھی نہ صرف اس کالم میں بلکہ پہلے بھی ہمیشہ میرے ذکر کے ضمن میں، میری انتہائی بے بضاعتی کے علی الرغم، پوری سنجیدگی اور 'وقار' کو ملحوظ رکھا ہے اور ـ ثالثاً اس وجہ سے کہ جو سوالات انہوں نے اٹھائے ہیں وہ فی نفسہٖ بہت اہم ہیں اور ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہیں جس کے ضمن میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں اشکالات موجود ہیں ـــــ میں اپنی رائے قدرے وضاحت سے پیش کر رہا ہوں ـــــ اگرچہ اندیشہ ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا مقالہ بن جائیگا۔

چونکہ ۳ مارچ کو ہفتہ عشرہ گذر چکا ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ جواب سے قبل 'صاحبِ سرِ راہے' کی پوری عبارت درج کر دی جائے تاکہ سوالات سامنے آجائیں!

"امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بالقابہ نے اپنے ایک تازہ ارشاد میں فرمایا ہے کہ اسلامی نظام میں جملہ اراضی ریاست (حکومت) کی ملکیت ہوگی اپنی تنظیم کے منشور کے سلسلے میں فرمایا کہ شرعی حدود کے اندر انفرادی ملکیت اور آزاد معاشی جدوجہد کی فضا برقرار رہے گی، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کی شرعی حدود میں کیا اراضی نہیں آئے گی؟ اگر نہیں آئے گی تو مالکانہ اراضی کی محرومی کا نعم البدل کیا ہوگا؟ ڈاکٹر صاحب کو اس مسئلے میں ذرا وضاحت فرمانی چاہیئے کہ اشتباہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ پاکستان میں اراضی کی ملکیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اسے حل کرنے کے لئے بڑی دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ اس لئے نہیں کہ مالکانِ اراضی ملکیت پر حریص ہیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ریاست یا بالفاظ دیگر حکومت کن افراد پر مشتمل ہوگی جو اس پیچیدہ مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش اور سکت رکھتے ہوں۔

اس سلسلے میں میری معروضات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اخلاقی اور ایمانی تعلیمات کی سطح پر اسلام میں انفرادی اور قومی سے قطع نظر سے 'انسانی ملکیت' ہی کا تصور موجود نہیں ہے۔ بلکہ کل کائنات کا بلا شرکت غیرے واحد مالک صرف اللہ عزّ وجل ہے جو ہر شئے اور کل موجودات کا خالق اور رب بھی ہے اور مالک اور مَلِک (بادشاہ) بھی۔ چنانچہ انسان خود مملوک ہے اور اپنے جسم اور اعضاء و جوارح تک کا مالک نہیں ہے تو اپنے وجود سے خارج کسی چیز کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے خواہ اس کے اعضاء و جوارح ہوں

خواہ مال و دولت کی مختلف صورتیں سب اللہ کی ملکیت اور انسان کے پاس 'امانت' ہیں بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ماست در حقیقت مالک ہر شے خداست

۲۔ البتہ قانونی اور فقہی سطح پر اسلام انسانی ہی نہیں، انفرادی ملکیت کو بھی تسلیم کرتا ہے جو اصلاً 'حق ملکیت' نہیں بلکہ صرف 'حق تصرف' ہے تاہم مجازاً حق ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حق ملکیت کے ضمن میں دو باتیں اہم ہیں:۔

(ا) یہ حق ملکیت نہ صرف اشیاء صرف (Articles of use) کے ضمن میں ثابت ہے بلکہ 'ذرائع پیداوار' (Means of Production) کے ضمن میں بھی مسلّم ہے۔ گویا نقد کی جملہ صورتیں، منقولہ و غیر منقولہ اموال کی تمام قسمیں، دکانیں، کارخانے اور زرعی و سکنی جملہ اقسام کی اراضی سب انسان کی ذاتی ملکیت میں ہو سکتی ہیں۔

(ب) مزید برآں، کم از کم میرے علم و فہم کی حد تک، اس حق ملکیت یا حق تصرف پر اسلام نے کوئی حد (Limit) مقرر نہیں کی ہے اور اپنی ضروریات سے زائد چیزوں کو اللہ کی رضا کے لئے دوسروں کو دے ڈالنے کی ترغیب و تشویق اخلاقی و روحانی سطح پر ہے، قانونی اور فقہی سطح پر نہیں۔

۳۔ رہا زمین کا معاملہ تو اس کے ضمن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اسلامی فقہ کی رُو سے اراضی کی دو بڑی بڑی قسمیں ہیں: ایک عُشری اور دوسری خراجی ـــــ عُشری اراضی افراد کی ملکیت ہوتی ہیں اور ان کی پیداوار سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جو بارانی یا قدرتی ذرائع سے سیراب ہونے والی زمینوں کی صورت میں کُل پیداوار کا عُشر یعنی دسواں حصّہ ہوتا ہے اور نہری، چاہی یعنی انسانی کوشش و محنت سے سیراب ہونے والی زمینوں کی کُل پیداوار کا نصف عُشر یعنی بیسواں حصّہ ہوتا ہے ـــــ جبکہ خراجی زمینیں انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال کی ملکیت ہوتی ہیں۔ گویا جدید اصطلاح میں 'قومی ملکیت' ہوتی ہیں اور ان کے کاشت کار ریاست کے مزارع ہوتے ہیں جن سے 'خراج' وصول کیا جاتا ہے جو براہِ راست بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔ زمینوں کی یہ تقسیم حضرت عمر فاروقؓ کے اجتہاد پر مبنی ہے جس پر 'اجماع' ہو گیا تھا۔

عُشری زمینیں وہ ہوتی ہیں جن کے مالک بغیر لڑے بھڑے برضا و رغبت ایمان لائے تھے اور خراجی زمینیں وہ ہوتی ہیں جو ظہورِ اسلام کے بعد سے آج تک کسی بھی مرحلے پر

مسلمانوں نے بزورِ شمشیر فتح کی ہوں۔ ایسی زمینیں ہمیشہ خراجی رہیں گی خواہ بعد میں کسی مرحلے پر وہ پھر کفار کے قبضے میں چلی گئی ہوں اور پھر کسی موقع پر ان کے مالکان برضا و رغبت ایمان لے آئے ہوں۔ ایسی زمینوں کے سابق مالکان اسلامی ریاست کے 'مزارعین' کے درجے میں ہوں گے اور ان کے ساتھ 'خراجِ مقاسمت' یعنی پیداوار کے ایک معین حصے (بٹائی) کا معاملہ بالاجماع جائز ہے۔

۴۔ رہا عشری اراضی یعنی انفرادی ملکیت میں داخل زمینوں کے ضمن میں مزارعت کا معاملہ تو اس کے ضمن میں سلف سے ایک اختلاف چلا آرہا ہے۔ یعنی اس پر تو 'اجماع' ہے کہ بہترین صورت اور اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کا تقاضہ تو یہی ہے کہ انسان یا تو اپنی زمین پر خود کاشت کرے یا اسے اپنی کسی بھائی کو دیدے۔ اس صورت میں اعلیٰ ترین شکل تو یہ ہے ہبہ یا ہدیہ کر دے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دینا صرف عاریۃً ہو۔ گویا ملکیت اصل مالک کی برقرار رہے۔ البتہ فصل پوری کی پوری کاشت کرنے والے کی ہوگی، اس کا کوئی حصہ مالک کا نہیں ہوگا۔ اس سے نیچے اتر کر مزارعت یا بٹائی کا معاملہ مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ

(الف) امام اعظم امام ابوحنیفہؒ اور امام دارالہجرت امام مالکؒ دونوں کے نزدیک مزارعت قطعاً حرام ہے اور اس کی کوئی بھی صورت قطعاً جائز نہیں!

(ب) البتہ امام ابوحنیفہؒ کے دو جلیل القدر شاگردوں یعنی امام محمدؒ اور قاضی ابویوسفؒ نے بعض اضافی شرائط عائد کرکے مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور اب فقہِ حنفی کا مفتی بہ قول یہی ہے ——— متاخرین میں سے امام احمد ابنِ حنبلؒ اور امام بخاریؒ وغیرہم کی رائے بھی مزارعت کے جواز کی ہے!

(ج) امام شافعیؒ کا موقف ان دونوں کے بین بین ہے ——— یعنی وہ باغ کے تابع کھیتی میں مزارعت کے جواز کے قائل ہیں لیکن کھلے کھیت میں جائز نہیں سمجھتے۔

۵۔ رہا متعین طور پر پاکستان کی اراضی کا معاملہ تو یہ مسئلہ اجتماعی سطح پر تحقیق کا بھی طالب ہے اور فیصلے کا بھی، انفرادی سطح پر اس کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جو دو ماہ کے لگ بھگ عرصہ مرحومہ فیڈرل کونسل عرف 'مجلسِ شوریٰ' میں گزارا تھا اس کے دوران ایک تقریر میں تجویز پیش کی تھی کہ زمین کے مسئلے کے فیصلے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیشن مقرر کیا جائے جس میں جید علماء کرام اور ماہرینِ فقہ اسلامی بھی ہوں اور جدید بندوبست اراضی

کے ماہر اور Experts بھی ——— اور یہ کمیشن ایک جانب شریعت کے احکام اور دوسری جانب وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر پاکستان کے لئے ایک نیا بندوبست اراضی تجویز کرے۔ چنانچہ اولاً یہ طے کرنا ہوگا کہ پاکستان کے کن علاقوں کی زمینیں عُشری ہیں اور کن کی خراجی، پھر جو علاقے عشری قرار پائیں ان کے بھی مالکانِ اراضی کی ملکیت کی نوعیت پر غور ہوگا کہ آیا وہ ان کی موروثی زمینیں ہیں یا ایک کافر حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کے صلے میں عطا شدہ جاگیریں، اس کے بعد یہ معاملہ غور طلب ہوگا کہ آیا جائز (GENUINE) عُشری اراضی پر بھی مزارعت کے جواز کا اطلاق ہو یا امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے فتویٰ کا! ——— اور آخر میں (Last But Not The Least) یہ طے کرنا ہوگا کہ نیا بندوبست اراضی بطریقِ احسن کس طور وطریق اور کس ترتیب وتدریج سے نافذ کیا جائے۔

۶ البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان میں کسی جمہوری یا انتخابی عمل کے ذریعے یہ انقلابی اقدام ممکن نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہاں انتخابات کتنے ہی منصفانہ اور غیر جانب دارانہ کیوں نہ ہوں ان میں کامیاب ہونے والوں کی عظیم اکثریت جاگیرداروں، وڈیروں اور بڑے زمینداروں ہی پر مشتمل ہوگی اور ان سے یہ توقع بالکل عبث اور خالص طفلانہ ہوگی کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا پسند کریں گے۔ گویا یہ تبدیلی صرف 'انقلاب' کے راستے سے آسکتی ہے ——— اور یہ انقلاب وقت کا وہ اٹل تقاضہ ہے جو بہر صورت آکر رہے گا اور اگر خدانخواستہ 'اسلامی انقلاب' کی صورت میں نہ آیا تو لامحالہ 'اشتراکی انقلاب' کی صورت میں آئے گا۔ جس میں نہ عشری اور خراجی کا فرق زیر بحث آئے گا ——— نہ ہی مزارعت کے جواز یا عدم جواز پر غور ہوگا بلکہ تمام اراضی بالجبر قومیالی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ تنظیم اسلامی نے انتخاب کے بجائے انقلاب کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور جو منشور شائع کیا ہے وہ اس کا انتخابی منشور نہیں بلکہ 'اسلام کا انقلابی منشور' ہے۔ جس میں زمین سے متعلق پوری دفعہ یہ ہے:

- جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور خواہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے اس متفقہ فتویٰ پر عمل کے ذریعے سے کہ مزارعت حرام ہے خواہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر مبنی فقہ حنفی کے اس فتویٰ پر عمل کے ذریعے کہ جو علاقے کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح ہوئے تھے ان کی اراضی انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال

کی ملکیت ہوتی ہیں۔ زمینداری کی جملہ خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔

خدا آں ملتے را سروری داد کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت!
بآں قومے سروکارے ندارد کہ دہقانش برائے دیگراں کشت!

(علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ خدا اس قوم کو قیادت اور رہنمائی عطا کرتا ہے جو اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھتی ہے۔ اسے اس قوم سے کوئی سروکار نہیں جس کے کسان دوسروں کے لئے کاشت کرتے ہیں)۔

۷ بالفرض اگر پاکستان کی جملہ اراضی 'خراجی' بھی قرار پائیں تب بھی انفرادی ملکیت صرف زمین کی حد تک خارج از بحث ہوگی۔ بقیہ چیزوں میں اس کا نفاذ و اجرا جاری رہے گا۔ مثلاً ایک شخص خراجی زمین کاشت کرتے ہوئے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں سے اپنے اخراجات کے بعد جو کچھ بچالے اسے کسی کاروبار میں لگا سکتا ہے اور یہ پورا سلسلہ اس کی انفرادی ملکیت ہوگا جس سے قانوناً فرض زکوٰۃ وصول کی جائے گی، اگرچہ اخلاقی اور روحانی سطح پر اسے تلقین کی جائے گی کہ اسے اپنی ملکیت نہ سمجھے بلکہ اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے اسے ناداروں اور محتاجوں کا حق سمجھ کر "حق بحق دار رسید" والا معاملہ کرکے سرخرو ہو جائے۔ تاہم اگر وہ اس ہلدی کی گانٹھ پر حق ملکیت جما کر پنساری بن بیٹھتا ہے تو قانونِ اسلامی اس کے آڑے نہیں آئے گا بلکہ اس کی وفات پر اس کے ترکے میں قانونِ وراثت کا اجرا ہوگا۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ!

۳۔ ایک ناخوشگوار وضاحت

راقم الحروف نے اپنی تقاریر اور دروس میں بارہا وضاحت کی ہے کہ اگرچہ میں اصولاً تصوّف کا مخالف نہیں ہوں بلکہ قرآن حکیم اور حدیثِ رسولؐ میں مذکورہ 'احسان' کو تو میں دین کی اصل جان سمجھتا ہوں۔ تاہم میں تصوّف کے مروّجہ سلاسل میں سے کسی سلسلے سے منسلک نہیں ہوں۔ اور اس کے باوجود کہ میں متعدد معروف بزرگانِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوا، آج تک کسی پر میرا دل اس درجہ نہیں ٹھکا کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا ـــــ چنانچہ عملاً میرا معاملہ وہی ہے

جو شیخ علی ہجویریؒ نے 'کشف المحجوب' میں تحریر فرمایا ہے کہ جس شخص کو کوئی مرشد نہ مل سکے اس کا مرشد قرآن ہے! چنانچہ میری اصل بیعت تو قرآن مجید سے ہے ـــــ ثانیاً میں اپنے طور پر اس سلسلہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق عمل پیرا ہوں جس کی بیعت مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ لیا کرتے تھے۔

لیکن گذشتہ دنوں اپنے ماہانہ درسِ قرآن کے لئے اسلام آباد جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے میرا موٹڑی (ضلع گجرات) جانا ہوا۔ جسے اخبارات میں بہت غلط رنگ میں پیش کیا گیا ـــــ بنا بریں یہ ناخوشگوار وضاحت ضروری ہے!

دسمبر ۸۵ء میں جب میں ابوظہبی میں مقیم تھا مجھے ایک پیغام ملا کہ خواجہ محمد معصوم پیر صاحب موٹڑی شریف، بھی یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے ان کا نام تو بارہا سنا اور پڑھا تھا لیکن ان سے واقفیت بالکل نہ تھی۔ تاہم ایک معروف شخصیت ملاقات کی دعوت دے تو اس سے انکار کسی طور سے درست نہیں ہے۔ لہٰذا میں اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت چونکہ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ لہٰذا بہت مختصر ملاقات ہو سکی۔ تاہم میں نے وعدہ کر لیا کہ ان شاء اللہ پاکستان میں آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر کچھ سمجھوں سمجھاؤں گا۔!

فروری کی ۸، تا ۹ تاریخ کو خواجہ صاحب کا دو مرتبہ فیصل آباد سے فون آیا اور انہوں نے وعدہ کے ایفاء پر زور دیا۔ چنانچہ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ۲ مارچ کو حاضر ہوں گا۔ بعد میں میں نے پیغام بھیج کر ۳، مارچ کی حاضری کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ اپنے پانچ چھ رفقاء کی معیت میں میں وہاں گیا ـــــ لیکن توقع کے بالکل خلاف وہاں میں نے 'خانقاہ' تو کوئی نہ پائی صرف ایک بزرگ کا نہایت شاندار اور زرکثیر سے تعمیر شدہ 'مزار' پایا جسے عرفِ عام میں 'دربار' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان بزرگ کی قبر کی بھی میں نے خالص مسنون طریقے پر زیارت کی ـــــ بعد ازاں ملحقہ مسجد میں ایک مختصر نشست ہوئی جس میں اولاً قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کی گئیں۔ بعد ازاں ایک صاحب نے نعت پڑھی۔ اور اس پر تو خوشی ہوئی کہ نعت پڑھنے والے صاحب بھی پابندِ شرع تھے ـــــ اور نعت کے مضامین بھی پاکیزہ اور شریعت کی حدود کے اندر اندر تھے ـــــ لیکن جس انداز میں حاضرین نے 'نذرانے' پیش کئے وہ ہم سب کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ (واضح رہے کہ ہم میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا)۔ (باقی صفحہ ۸۷ پر)

اِن شاء اللہ العزیز ——— اِس سال

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام سالانہ محاضرات میں، جو

۲۸ مارچ تا ۳ اپریل ۸۶ء - جناح (ٹاؤن) ہال لاہور

میں روزانہ نماز مغرب کے فوراً بعد منعقد ہوں گے

استحکامِ پاکستان

کے موضوع پر مذاکرہ ہوگا، جس میں

جیّد علماء کرام، قومی و سیاسی رہنما اور نامور دانشور

حصّہ لیں گے، اور اس میں انجمن کے صدر مؤسّس

ڈاکٹر اسرار احمد

کی اِس موضوع پر تالیف، جو پہلے روزنامہ جنگ اور بعد ازاں ماہنامہ میثاق میں بالاقساط شائع ہو چکی ہے اور اِن شاء اللہ اُس وقت تک کتابی صورت میں بھی آجائیگی۔

تنقید و تبصرہ

کے لیے پیش ہوگی ——— شرکت کی دعوت عام ہے!

ڈاکٹر اسرار احمد کی زیرِ تالیف تصنیف

استحکامِ پاکستان

دوسرے حصے میں

تصویر کا روشن رُخ

باب ششم : پاکستان کا معجزانہ قیام
باب ہفتم : قائدِ اعظم کی غیر معمولی شخصیت

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور پاکستان

باب ہشتم : نصرت و حفاظتِ خداوندی
باب نہم : اسلام کا عالمی غلبہ اور پاکستان
باب دہم : 'الفِ ثانی' کی تجدیدی مساعی اور برِّ صغیر پاک و ہند

خلاصۂ مباحث

باب یازدہم : استحکامِ پاکستان کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب

باب ششم

پاکستان کا معجزانہ قیام

ہمارے قومی و ملی وجود کی تصویر کا روشن اور تابناک رُخ بالکلیہ ارادہ و مشیتِ ایزدی اور تائید و نصرتِ الٰہی کا مظہر ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان کا عالمِ وجود میں ظہور بھی ایک خالص 'معجزہ' کی حیثیت سے ہُوا تھا اور اُس کا اب تک قائم رہنا بھی 'معجزات' ہی کے تسلسل کا مرہونِ منت ہے!

یہ اُمور اگرچہ اصلاً "رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں!" کے ذیل میں آتے ہیں اور اِس قبیل کے اکّا دُکّا واقعات کو تو پہچاننا بھی صرف اُن لوگوں کا کام ہے جن کا باطن منوّر ہو اور جو "گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!" کی کیفیت کے ضمن میں رُسوخِ تام حاصل کر چکے ہوں ـــــ تاہم جب ان معجزات کا تسلسل ہو اور خرقِ عادت واقعات پے در پے ظہور پذیر ہو رہے ہوں تو ایک عامی انسان بھی اِن کا ادراک کر سکتا ہے، بشرطیکہ اُسے ایک ایسے قادرِ مطلق اور فاعلِ حقیقی خدا پر کسی درجے میں ایمان حاصل ہو جو اِس کائنات کا خالق، باری اور مصوّر ہی نہیں، مالک، حاکم اور مدبّر بھی ہے۔ چنانچہ کُل سلسلۂ اسباب و عِلل اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور نتائج و عواقب کا ظہور بالکلیہ اُسی کے اِذن و مشیت کے تابع ہے، یہاں تک کہ ایک پتّہ بھی اُس کے علم و اِذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا اور ایک حدیثِ نبویؐ کے مطابق "تمام انسانوں کے دِل اُس رحمٰن کی دو اُنگلیوں کے مابین ہیں، اُنہیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے!"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام و بقا کے ضمن میں 'معجزانہ نوعیت' کے واقعات کا ظہور اِس تسلسل کے ساتھ ہُوا ہے کہ کوئی بالکل ہی کور باطن ہو تو اور بات ہے ورنہ ہر صاحبِ دیدۂ بینا کو صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان کا قیام ارادہ و مشیتِ خداوندی کے

ایک خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا وجود یقیناً تدبیرِ الٰہی کے کسی طویل المیعاد منصوبے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے معجزات اور خارقِ عادت واقعات کے بارے میں بعض اہم اُمور کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

اوّلاً یہ کہ اُن مخلوقات کے ضمن میں جو نہ صاحبِ ارادہ و شعور ہوں، نہ سزاوارِ جزا و سزا، 'معجزات' طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو علانیہ توڑ اور پھاڑ کر ظاہر ہوتے رہے ہیں، جیسے کبھی ایک چٹان سے حاملہ اُونٹنی برآمد ہو گئی، کبھی آگ ابراہیمؑ کے لیے گل و گلزار بن گئی، کبھی موسےٰؑ کے عصا نے زندہ اور متحرک اژدہے کی صورت اختیار کر لی اور کبھی اُس کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹ گیا' وغیر ذالک!

لیکن انسان چونکہ ایک مکلّف اور مستحقِ جزا و سزا وجود کا حامل ہے جس کے لیے ارادہ و اختیار کی آزادی لازمی و لابُدی ہے۔ لہٰذا انسانی معاملات میں اللہ تعالےٰ کے خصوصی ارادہ و مشیّت کا ظہور کبھی اِس طور سے نہیں ہوتا کہ انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی سلب ہو جائے بلکہ قدرت و حکمتِ خداوندی کا کمال یہ ہے کہ ارادہ و اختیار کی جیسی اور جتنی کچھ آزادی انسانوں کو عطا ہوئی ہے وہ بھی برقرار رہتی ہے اور اِس کے باوصف تدبیرِ امر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی تصرّف بھی بروئے کار آتا رہتا ہے اور اس طرح قدرت کے ارادے اور منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچتے رہتے ہیں چنانچہ کبھی کسی دشمن کی لات کسی کُبڑے کے جسمانی عیب کے ازالے کا سبب بن جاتی ہے اور کبھی برادرانِ یوسفؑ کا یوسفؑ کو حسد سے مغلوب ہو کر چاہِ کنعان میں پھینک دینا "تدبیر کُند بندہ تقدیر کند خندہ" کے مصداق یوسفؑ کے دُنیوی عروج کا زینہ اور تمکّن فی الارض کا ذریعہ بن جاتا ہے، وفس علیٰ ذالک!

دوسری اہم حقیقت جو پیشِ نظر رہنی چاہیئے یہ ہے کہ جبکہ انسان ہر حال میں اللہ تعالےٰ کے قانونِ تشریعی کا پابند ہے جس کے ضمن میں مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم تو

بہت ہی اہم ہے کہ اسی پر اسلامی تمدّن و معاشرت کے پورے نظام کی اساس اور اسلامی ریاست و حکومت کے پورے ڈھانچے کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اسی طرح محسن و متقی اور فاسق و فاجر کا فرق بھی بہت اہم ہے جو اُخروی انجام پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اُمورِ تکوینیّہ کے ضمن میں قدرتِ خداوندی اِن حدود و قیود کی پابند نہیں ہے بلکہ اِن سے بالکلیّہ آزاد اور بلند و بالا سطح پر تدبیر امر کرتی ہے —— چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ارادۂ خداوندی کسی قانونی و فقہی اعتبار سے مسلمان لیکن اعمال و اخلاق کے اعتبار سے فاسق و فاجر قوم کی تنبیہہ اور سرزنش کے لیے حرکت میں آتا ہے تو کوئی کافر و منکر اور باغی و مشرک قوم "دستِ قضا" میں شمشیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جیسے سابقہ اُمّتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ضمن میں کبھی بخت نصر اور ٹائٹس رومی اور موجودہ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے کبھی چنگیز و ہلاکو اور کبھی ہنود و یہود! —— اِسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرتِ خداوندی کسی مسلمان قوم کی فلاح و بہبود حتّٰی کہ اپنے دین کی حفاظت و مدافعت کے لیے کسی عامی و عاصی مسلمان سے کوئی خدمت لے لیتی ہے، جیسے حدیث نبویؐ میں وارد ہوا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ" (صحیح مسلم: کتاب الایمان) ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت و نصرت فاسق و فاجر انسان کے ذریعے بھی کرتا ہے" جس کی نمایاں ترین مثال بھٹو صاحب کے ہاتھوں قادیانیوں کا غیر مسلم قرار دیا جانا ہے —— ! بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قدرتِ خداوندی کبھی اسلام کی کوئی جزوی خدمت کسی غیر مسلم یا انتہائی برخود غلط اور حد درجہ ضالّ اور مُضِلّ انسان سے بھی لے لیتی ہے، جیسے برّصغیر پاک و ہند میں انگریزی دَور کے آغاز میں اسلام پر عیسائی پادریوں کی جارحانہ پیش قدمی کی روک تھام کے ضمن میں راجہ رام موہن رائے کی تالیف "تحفۃ الموحّدین" اور بعد میں آریہ سماجیوں کے حملے سے مدافعت کے ضمن میں آنجہانی غلام احمد قادیانی کی تصنیف "سُرمۂ چشمِ آریہ"۔

یہ حقیقت کہ پاکستان کا قیام ایک 'معجزہ' تھا پورے طور پر تو اُسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب برّصغیر پاک و ہند میں ہندو مسلم مسئلے کے پورے تاریخی پس منظر کو سمجھا جائے اور خاص طور پر اُن نئی پیچیدگیوں کا فہم و شعور اور اُن نئی جہتوں کا

ادراک حاصل کیا جائے جن کا اضافہ اِس انتہائی اہم اور نازک مسئلے میں انگریزوں کے لگ بھگ دو صد سالہ دورِ اقتدار میں ہُوا تھا، جن کے نتیجے میں صورتِ حال بالکل برعکس ہوگئی تھی اور شدید اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ مستقبل میں ماضی کے حاکم، محکوم اور محکوم حاکم بن جائیں گے! اِس لیے کہ اسی طرح یہ حقیقت پورے طور پر منکشف ہوسکتی ہے کہ پاکستان کا قیام اُسی ارادۂ خداوندی کا ظہور تھا جو لگ بھگ سوا تین ہزار سال قبل مصر میں ظاہر ہُوا تھا جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۂ قصص کی آیت ۵ میں ان الفاظ میں ہُوا ہے: (ترجمہ) "اور ہم چاہتے تھے کہ اُن لوگوں پر احسان فرمائیں جو مُلک میں دبا لیے گئے تھے!" لیکن ظاہر ہے کہ یہ بحث بہت طویل ہے اور موجودہ تحریر کی تنگ دامانی اِس کی متحمل نہیں ہوسکتی —— تاہم ان شاء اللہ العزیز ایک صاحبِ عقل و بصیرت انسان کے لیے برِصغیر کے ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات کا سرسری جائزہ بھی اِس حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی ہوگا کہ پاکستان کا قیام ایک 'معجزہ' اور مشیتِ ایزدی و قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں 'قراردادِ پاکستان' منظور ہو جانے کے بعد برِصغیر کے میدانِ سیاست میں متحارب و متقابل قوتوں کے جائزے کا لبِ لباب یہ بنتا ہے کہ:

ایک جانب پوری ہندو قوم تھی جو 'اکھنڈ بھارت' کو اپنے دھرم یعنی 'دین و ایمان' کا مسئلہ بنائے ہوئے تھی اور اُس کے نزدیک بھارت کی تقسیم 'گئو ماتا' کے ٹکڑے کر دینے کے مترادف تھی اور یہ معاملہ اُن کے نزدیک کس قدر جذباتی نوعیت کا تھا اِس کا اندازہ گاندھی جی کے اُس تاریخی جملے سے لگایا جاسکتا ہے جو تقسیمِ ہند کے آخری فیصلے سے کچھ ہی دن پہلے اُن کی زبان سے نکلا تھا یعنی "پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے" (مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا وِنز فریڈم۔ صفحہ ۱۹۷)۔ یہاں یہ واضح رہے کہ گاندھی جی کوئی عام اور غیر اہم انسان نہیں تھے بلکہ جدید ہند کے بہت بڑے سیاسی لیڈر اور ہندوؤں کے لیے تو ایک عظیم رہنما ہی نہیں 'مہاتما'

تھے! اور اُنہیں عام طور پر جذباتی اور مشتعل مزاج انسان نہیں سمجھا جاتا!!

'اکھنڈ بھارت' کے اِس قدر جذباتی اور پُرجوش حامی تو اگرچہ صرف ہندو ہی تھے۔ لیکن انہیں اس معاملے میں بھرپور تائید حاصل تھی ہندوستان کی جملہ غیر مسلم اقوام کی ـــــ جیسے سکھ، پارسی اور عیسائی!! ـــــ اور اس پر مستزاد یہ کہ خود مسلمانوں کے بعض فعّال عناصر تقسیمِ ہند کے خلاف تھے جن میں اہم ترین معاملہ تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زیرِ قیادت کانگریسی مسلمانوں اور مولانا حسین احمد مدنی رح کی زیرِ سرکردگی جمعیت علمائے ہند اور اُن کے متوسلین اور معتقدین کا تھا! پھر پنجاب میں مجلسِ احرارِ اسلام ایسی زوردار عوامی خطباء و مقرّرین پر مشتمل جماعت تھی اور سرحد میں خدائی خدمت گار دں جیسا پُرجوش عوامی کارکنوں کا گروہ تھا!

اِدھر ہندو خود بھی مسلمانوں کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ تعداد کے اعتبار سے لگ بھگ تین گُنے تھے، بلکہ دولت و سرمایہ اور تجارت و صنعت پر تو تقریباً بلا شرکتِ غیرے قابض تھے اور تعلیم، قومی بیداری اور سیاسی تنظیم کے اعتبار سے بھی بہت آگے تھے ـــــ اور 'اکھنڈ بھارت' کے پلڑے میں اضافی وزن پڑ رہا تھا دیگر غیر مسلم اقوام اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا ـــــ اور ان سب کے مقابلے میں تھی مسلمان عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے والی صرف مسلم لیگ! گویا معاملہ بالکل وہی تھا کہ ؎

"لڑا دے ممولے کو شہباز سے!" یا ؎ "اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!!"

چنانچہ اعداد و شمار، حالات و واقعات اور اجتماعیات و عمرانیات کے کسی بھی اصول اور قاعدہ کی رُو سے 'مطالبۂ پاکستان' ایک دیوانے کے خواب اور مجذوب کی بَڑ یا زیادہ سے زیادہ سودے بازی کے حربے سے بڑھ کر نظر نہ آتا تھا۔

اِس پر مزید اضافہ کیجیے اِس کا کہ برطانیہ میں اُس وقت لیبر پارٹی کی حکومت تھی جس کی ہمدردیاں واضح طور پر کانگریس کے ساتھ تھیں اور ہندوستان کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کو اُس نے اپنی پالیسی کا سنگِ بنیاد (CORNER STONE)

بنالیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب اِس حکومت کے فرستادہ وزارتی مشن نے اپنا منصوبہ پیش کیا تو اُس کی تمہید کے طور پر واضح الفاظ میں ہندوستان کی تقسیم کو غیر معقول اور ناقابلِ عمل قرار دے کر رد کر دیا تھا ـــــ مزید برآں اُس وقت تو یہ حقائق صرف اہلِ نظر کی نگاہ اور واقفِ حال لوگوں کے علم میں ہوں گے لیکن اب تو یہ تمام راز طشت از بام ہو چکے ہیں کہ شخصی اعتبار سے برطانوی وزیرِ اعظم ایٹلے کو مسلم لیگ اور قائدِ اعظم سے ذاتی بُغض تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس کے ہاتھوں قدرت نے ہندوستان کو بالفعل تقسیم کرایا ایک طرف خود گاندھی کا چیلا تھا تو دوسری طرف پنڈت نہرو کی دوستی صرف اُس ہی سے نہیں اس کے پورے 'خاندان' سے تھی۔ جبکہ قائدِ اعظم سے اُسے ذاتی پرخاش اور نفرت تھی!!

اُدھر وہ مسلم قوم جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا جس انتشارِ ذہن و فکر اور پراگندگیٔ عمل کا شکار اور ہمت و جرأت کے زوال سے دوچار تھی، اُس کا اندازہ اِس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ چند ہی سال قبل مستقبل کے قائدِ اعظم اور معمارِ پاکستان نے قوم سے بددل اور مایوس ہو کر وطنِ عزیز سے باضابطہ 'ہجرت' کر لی تھی اور مستقل طور پر انگلستان میں جا ڈیرا لگایا تھا اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں یہ الفاظ کہے تھے:

"ہندو کوتاہ اندیش ہیں اور میرے خیال میں ناقابلِ اصلاح!
اور مسلمانوں کی صفیں ایسے کم ہمت لوگوں سے بھری پڑی ہیں جو میرے
ساتھ بات کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر سے پوچھیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے!
ان دو گروہوں کے مابین مجھ جیسے آدمی کی جگہ کہاں ہے؟"

(شیخ محمد اکرام: ماڈرن مسلم انڈیا)

مزید برآں خود اُس جماعت اور اُس کے وابستگان کا عالم کیا تھا جس نے حصولِ پاکستان کے لیے کمر کسی تھی، اِس کا اندازہ کرنے کے لیے قائدِ اعظم کے اُس مشہور جملے کو ذہن میں تازہ کر لینا کافی ہے کہ "میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔!"

اِن حالات و واقعات کے مدِّنظر کون کہہ سکتا ہے کہ برِّصغیر کی تقسیم اور پاکستان کا قیام کسی 'معجزہ' سے کم تھا!!

—— اور اگر کسی کو اِس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو اور شک و شبہ کی گنجائش نظر آئے تو اِس ضمن میں آخری فیصلہ کن معاملہ 'کیبنٹ مشن پلان' کا ہے جس کے بعد اِس امر میں کسی شک کا شائبہ بھی باقی نہیں رہ جاتا کہ پاکستان کا قیام مشیّت و قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس پلان کے مصنفین نے ہندوستان کی تقسیم کو نامناسب ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل قرار دے کر گویا بزعمِ خویش آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی اور اُس کے بجائے ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت کے تحت تین خطّوں (ZONES) پر مشتمل وفاق کا نقشہ پیش کیا تھا!

ہندوستان کے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ قائدِ اعظمؒ کی سیاسی زندگی کا نازک ترین مرحلہ اور اُن کے تدبّر و تحمّل اور دُور اندیشی و معاملہ فہمی کا سخت ترین امتحان تھا!—— اُنہیں ایک طرف صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت مختلف داخلی و خارجی عوامل کے تحت ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹنے پر تُلی ہوئی ہے اور اگر اِس مرحلے پر مسلم لیگ کی جانب سے ذرا بھی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ ہُوا تو لیبر پارٹی کی "ہز میجسٹیز گورنمنٹ" ہندوستان کی حکومت یکطرفہ طور پر کانگریس کے حوالے کر دے گی۔ اور پھر ہندوؤں کے چُنگل سے رہائی پانا شاید لاکھوں نہیں کروڑوں جانوں کی قربانی ہی سے ممکن ہو سکے! دوسری طرف یہ بات بھی واضح تھی کہ اِس منصوبہ کو تسلیم کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ نے ہار مان لی اور کم از کم وقتی طور پر آزاد اور خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبرداری اختیار کر لی اور گذشتہ چند برسوں کے دوران جو نفسیاتی اور جذباتی فضا ہندوستان کی مسلم قوم میں پیدا ہو چکی تھی اُس کے پیشِ نظر شدید اندیشہ تھا کہ اِس کے نتیجے میں یا مسلمان مشتعل ہو کر قابو سے باہر ہو جائیں گے یا اُن کے حوصلے اور ولولے ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائیں گے یا

کم ازکم مسلم لیگ اور خود قائدِ اعظم کی سیاسی موت واقع ہو جائے گی! گویا قائدِ اعظم اور مسلم لیگ دونوں کو اُس وقت ایک جانب کنواں اور دوسری جانب کھائی، والی صورتِ حال سے سابقہ تھا۔ البتہ کیبنٹ مشن پلان میں دو باتیں "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کا مصداق تھیں ـــــ ایک یہ کہ اُس میں بہ تین خطوں (ZONES) کی صورت میں پاکستان کے نقشے کی دُھندلی سی تصویر موجود تھی اور دوسرے یہ کہ دس سال کے بعد ہر خطے کے لیے مرکزی حکومت کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرِ ثانی کرنے کی گنجائش موجود تھی! ـــــ اِس طرح اُس وقت نہیں تو دس سال بعد آزاد پاکستان کے قیام کا امکان کم ازکم نظری طور پر موجود تھا۔ اگرچہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ ایک بار مرکزی حکومت کے قیام کے بعد اِس کا بالفعل امکان بہت کم تھا! ـــــ میرے نزدیک یہ قائدِ اعظم کے سیاسی تدبّر (STATESMANSHIP) اور واقعیت پسندی (REALISM) کا شاہکار تھا کہ انہوں نے ۶ جون ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا۔ اگرچہ اِس پر نہ صرف یہ کہ ہندو پریس نے خوب بغلیں بجائیں، تمسخر اڑایا، کارٹون شائع کیے اور اسے پاکستان کے تصور کی آخری اور حتمی تدفین قرار دیا بلکہ خود برطانوی حکومت نے بھی اِسے مسلم لیگ کی کمزوری پر محمول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کیبنٹ مشن پلان کے تحت بننے والی مرکزی حکومت کی تشکیل کے ضمن میں اپنے ایک صریح وعدے کی خلاف ورزی اور واضح اعلان سے انحراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی!

اِس موقع پر مشیّتِ ایزدی اور قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور اُس حدیثِ نبویؐ کے مطابق جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے کہ "تمام انسانوں کے دل اللہ تعالےٰ کی دو اُنگلیوں کے مابین ہیں، وہ انہیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے!" پنڈت نہرو کے اُن بیانات کی صورت میں ہُوا جو انہوں نے فتح کے نشے میں بدمست ہو کر دیئے ـ جن کے نتیجے میں کانگریس کی جانب سے پلان کی منظوری کی بالفعل نفی ہو گئی اور ہندو ذہنیت پوری طرح بے نقاب ہی نہیں بالکل عریاں ہو کر سامنے آگئی ـــــ اِس

نوع کی ایک حرکت پلان کے سامنے آتے ہی فوری طور پر خود مسٹر گاندھی سے بھی سرزد ہوگئی تھی لیکن ایک تو وہ کانگریس کے عہدیدار نہ تھے، دوسرے انہوں نے مشن کی جانب سے اُن کی غلط توجیہات کی تردید کے بعد مصلحتاً زبان کو بند رکھا۔ جبکہ پنڈت نہرو کا معاملہ دوسرا تھا، ایک تو وہ اُس وقت کانگریس کے صدر تھے، دوسرے اُن کے "ہٹ کے پکے" ہونے کا وصف مشہور و معروف تھا۔ لہٰذا اُن کے بیانات کے نتیجے میں مسلم لیگ کے لیے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا معقول جواز پیدا ہوگیا اور اگرچہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے پیچ در پیچ ریزولیوشن کے ذریعے پنڈت نہرو کے بیانات کی تلافی کی کوشش کی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور قائدِ اعظم ایسی عقابی نگاہ رکھنے والی شخصیت اِس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے والی نہیں تھی! چنانچہ ۲۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا اعلان کر دیا اور اس طرح ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کے قیام کا مسئلہ جو نظری طور پر کم از کم دس سال کے لیے اور حقیقتاً ہمیشہ کے لیے دفن ہوگیا تھا، از سرِ نو زندہ ہوگیا!!

اب ذرا بتایئے کہ اِس 'اعجازِ مسیحائی' کا سہرا بظاہر احوال اور اِس عالمِ اسباب و علل کی حد تک سوائے پنڈت نہرو کے اور کس کے سر باندھا جاسکتا ہے؟ — یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب (انڈیا ونز فریڈم) میں اپنے پورے سیاسی کیریئر کی صرف ایک ہی غلطی تسلیم کی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں کانگریس کا صدر بننا قبول نہ کیا — اور اِس طرح اُس وقت پنڈت نہرو کی صدارت کی صورت پیدا ہوئی اور اُن کی اِس عہدیدارانہ حیثیت ہی کی بنا پر اُن کے "فرمودات" کو وہ اہمیت حاصل ہوئی کہ کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے مسلم لیگ کے دام میں آجانے کے بعد بچ نکلنے کی صورت پیدا ہوئی۔ — ویسے غور کیا جائے تو پنڈت جی نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یا فتح کی "مستی" میں جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا اور واقعتاً صورت یہی تھی کہ اگر ایک بار

اُس پلان کے تحت انڈین یونین گورنمنٹ وجود میں آجاتی تو پھر کسی خطے (ZONE) کے علیٰحدہ ہونے کا بالفعل کوئی امکان نہ رہتا ــــ لیکن اُس وقت اِس "سچّی بات" کا زبان سے نکال دینا ہی اکھنڈ بھارت کے نقطۂ نظر سے سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اُن کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی نے اپنے پتا جی کے بارے میں کہا تھا کہ "ہمارے بابا تو صُوفی تھے اُنہیں سیاست نہیں آتی تھی!" ــــ اور شاید پنڈت جی کی ایسی ہی باتیں تھیں جن کی بنا پر چوہدری خلیق الزمان مرحوم نے کہا تھا کہ "پنڈت نہرو سے زیادہ سیاست تو میرا سائیس جانتا ہے!" (مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۴۳تا ۱۴۵ پر پنڈت جی کی ۱۹۳۷ء کی ایک ایسی ہی کوہ ہمالہ جتنی بڑی غلطی کا ذکر کیا ہے جس کا براہِ راست تعلّق چوہدری صاحب کی ذات سے تھا جس کی بنا پر مولانا آزاد کے نزدیک یوپی میں مسلم لیگ کی تحریک کو عروج حاصل ہُوا!)

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالےٰ کے خصوصی تصرّف کا مظہر تھا اور اس کے ذریعے اللہ تعالےٰ نے گویا مسلمانانِ ہند پر یہ حجّت قائم فرمائی تھی کہ تم تو ایک کلیتہً آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے تھے، ہم نے اپنی خصوصی مشیّت و قدرت کو بروئے کار لا کر تمہیں ایک کاملتہً آزاد و خود مختار پاکستان عطا فرمایا ــــ "تاکہ دیکھیں کہ اب تم کیا کرتے ہو!" (سورۃ یونس آیت ۱۴: لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ) ــــ چنانچہ یہ روایت مولانا حسین احمد مدنی رح کے معتقدین کے حلقے میں تواتر کے ساتھ بیان ہوتی ہے کہ مولانا نے ۱۹۴۶ء کے رمضان المبارک میں سلہٹ میں جہاں وہ عموماً ماہِ رمضان گذارا کرتے تھے فرما دیا تھا کہ "ملاءِ اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا ہے!" اور اس پر جب اُن کے کسی عقیدت مند نے سوال کیا کہ "پھر ہم کیا کر رہے ہیں؟" تو مولانا نے جواب دیا کہ "اِس معاملے کا تعلّق اُمورِ تکوینیہ سے ہے جن کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں!" او کما قال، واللہ اعلم!!

باب ہفتم

قائدِ اعظم مرحوم کی غیر معمولی شخصیت

قیامِ پاکستان کے ضمن میں مشیت و قدرتِ خداوندی کا دوسرا نمایاں ظہور قائدِ اعظم مرحوم کی قیادت کی صورت میں ہُوا تھا۔ اور اُس کے بعد سے اب تک یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت و حفاظت ہی کے ذریعے قائم ہے!

قائدِ اعظم کی قیادت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برِّ صغیر کے حالات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی اُس کے لازمی اور منطقی نتیجے کے طور پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب کم از کم مستقبل قریب میں انگریز کی غلامی سے نجات کا حصول کسی عسکری جدّوجہد کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ اور اِس کے لیے نہ کوئی داخلی بغاوت مفید ہو سکتی ہے نہ خارجی مداخلت بلکہ آزادی کی کوئی جدّوجہد اگر ممکن ہے تو صرف قانونی اور آئینی ذرائع سے! ان حالات میں مسلمانوں کو ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو انگریزوں کی اجتماعی نفسیات سے بھی کما حقّہٗ واقف ہو اور اُن سے اُن کی زبان اور محاورے میں گفتگو کر سکے، برطانوی پارلیمانی سیاست کے پیچ و خم اور اَسرار و رموز سے بھی پوری طرح آگاہ ہو اور آئینی و قانونی جنگ لڑنے کی صلاحیت و مہارت سے تو بدرجۂ اتم مسلح ہو ——

مسلمانانِ ہند کے قائدِ وقت کے لیے دوسرا لازمی وصف یہ درکار تھا کہ وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو اچھی طرح جانتا ہو اور اُن کے احساسات و جذبات اور مقاصد

عزائم کا علم اُسے بالواسطہ نہیں بلا واسطہ ذاتی تجربہ کی بنا پر حاصل ہُوا ہو نیز وہ ان کے مخصوص طریقہ ہائے واردات، سے بھی پوری طرح واقف ہو اور اُن کے رموز و اشارات کو بھی خوب سمجھتا ہو!—

ان دونوں اوصاف کے مطلوبہ حد تک حصول اور ان دونوں 'گھروں' کے بھیدی ہونے کے لیے لازمی تھا کہ وہ کافی مدت تک ع "کہ مَیں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ!" کے انداز میں ان دونوں کے 'اندر' رہا ہو اور اُس کی ذہنی و فکری اُٹھان اور سیاسی و عملی تربیت بلاتشبیہہ حضرتِ موسیٰؑ کی طرح، جن کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی، اِن دونوں 'دشمنوں' کے گھروں میں ہوئی ہو!—

کون نہیں جانتا کہ اِن دونوں شرائط پر بتمام و کمال پورا اُترنے والا شخص محمد علی جناح کے سوا کوئی نہیں تھا جس نے انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کی، اور وہاں قیام کے دوران انگریزوں کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا اور پارلیمانی طور طریقوں کو بھی خوب سمجھا اور اِس طرح گویا انگریزوں سے اُن ہی کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم حاصل کی، پھر تیس برس کی عمر (۱۹۰۶ء) سے جو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو یہ تعلق پورے چودہ سال تو بھرپور انداز میں جاری رہا (قائدِ اعظم نے کانگریس سے علیحدگی ۱۹۲۰ء کے ناگپور سیشن کے دوران اختیار کی تھی!) اِس کے بعد بھی لگ بھگ آٹھ برس وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اصلاً اسی عرصہ کے دوران اُن پر ہندو ذہنیت کا انکشاف ہُوا!

ظاہر بین لوگوں کے لیے یہ جملہ اُمور محض اتفاقیہ ہو سکتے ہیں لیکن ع "جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!" کے مصداق جن لوگوں پر باطنِ ایام بھی روشن ہوتا ہے اور جو جانتے ہیں کہ اِس کائنات میں کوئی واقعہ بھی خالص اتفاقی طور پر ظہور میں نہیں آتا انہیں اِن 'اتفاقات' میں بلاشبہ حکمت و قدرتِ خداوندی کا ظہور نظر آئے گا!

بے پناہ مقبولیّت

مزید انشراحِ صدر کے لیے ذرا ان اضافی دلائل کو بھی ذہن کے سامنے لے آیئے کہ اُس وقت تک مسلمانوں کی قیادت دو ہی طبقات کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ — ایک نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا طبقہ اور دوسرا علماءِ کرام کا طبقہ۔ قائدِ اعظم کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے نہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے ایک ایسے تجارت پیشہ خاندان میں آنکھ کھولی تھی جو طبقۂ متوسط ہی نہیں اس کے بھی زیریں حصّے سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا دُنیوی اعتبار سے وہ جو کچھ بھی تھے بالکلیہ 'خود ساختہ' (SELF-MADE) تھے۔ دوسری طرف اُن کے والدین کا مذہب 'امامیہ اسماعیلیہ' تھا اور اگرچہ وہ خود اوائل ہی میں اِن فرقہ وارانہ تقسیموں سے بلند ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہلوانا پسند فرماتے تھے لیکن جیسا اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے نہ وہ واقعتہً 'مذہبی' آدمی تھے نہ انہوں نے کبھی تکلفاً یا تصنعاً اپنے آپ کو اِس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ حال ہی میں ایک واقعہ یہ بھی پڑھنے میں آیا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران جب گاندھی جی نے ذرا دل لگی کے انداز (LIGHT VEIN) میں اُن سے کہا کہ "آپ مسلمانوں میں اِس لیے مقبول ہو رہے ہیں کہ آپ مذہب کا نام لیتے ہیں!" — تو قائدِ اعظم نے اُن کی تردید میں بطورِ دلیل اپنا طرزِ عمل پیش کیا کہ "دیکھ لیجیے! یہ رمضان کا مہینہ ہے اور میں آپ کے سامنے سگریٹ پی رہا ہوں!" — تیسری طرف اِس پر غور کیجیے کہ اُنہیں اُردو بس واجبی ہی سی آتی تھی اور وہ اِس میں تحریر و تقریر پر قادر نہ تھے۔ جبکہ کسی عوامی رہنما کے لیے عوام کی زبان میں اظہارِ خیال پر کما حقّہ قدرت نہایت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

اِس سب کے باوجود وہ اگر برِّ صغیر پاک و ہند کی دس کروڑ افراد پر مشتمل قوم کی اکثریت کے محبوب ترین رہنما بن گئے تو

کیا یہ خارقِ عادت، واقعہ نہیں ہے؟ اور کیا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ یہ سب کچھ مِن جانب اللہ تھا اور اس لیے تھا کہ اُن کے ذریعے اللہ کو اپنی ایک خصوصی مشیّت کی تکمیل کرنی تھی؟

غیر معمولی شخصیّت

قائدِ اعظم کی صلاحیّتوں کے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہونے کے علاوہ اُن کی شخصیّت کا ایک اور پہلو بھی معجز نما، تھا اور وہ یہ کہ سیرت و کردار اور شخصی اوصاف کے اعتبار سے وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں بالکل ہی نادر المثال اور عجوبۂ روزگار شخصیّت کے مالک تھے اور، علماء و مشائخ سے قطع نظر، جملہ ہمعصر سیاستدانوں میں کوئی ایک شخص بھی اُن کا ہمسر و ہم پلّہ تو دُور کی بات ہے، آس پاس بھی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اُن کے بدترین دُشمنوں نے بھی اُنہیں ضِدّی اور ہٹ کا پکّا (STUBBORN & OBSINATE)، اِنتہائی سَرد اور جذبات سے عاری خالص حسابی کتابی انسان (COLD & CALCULATING) یہاں تک کہ مغرور اور خود پسند (PROUD & HAUGHTY) تو کہا ـــــ لیکن کسی نے نہ کبھی اُن کی صداقت اور راست گوئی پر حرف رکھا، نہ دیانت اور امانت پر اور نہ کسی وعدہ خلافی کا الزام لگایا نہ فریب دہی کا بلکہ سب اُن کی صاف گوئی اور راست معاملگی (STRAIGHT DEALING) کا برملا اعتراف کرتے رہے اور یہ بات ہمیشہ مسلّم سمجھی جاتی رہی کہ جو کچھ اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے وہی اُن کی مراد ہوتی ہے اور نہ کبھی وہ عام سیاستدانوں کے مانند "کجامی نمائی کجامی زنی!" کا معاملہ کرتے ہیں نہ جھُوٹ، دھوکہ، فریب اور وعدہ خلافی سے کام لیتے ہیں، نہ اُن کے یہاں دروغِ مصلحت آمیز کا وجود ہے، نہ مصنوعی تواضع و مدارات کا

اور نہ ریاکارانہ انکساری موجود ہے نہ چاپلوسانہ خوشامد!

قائدِاعظم کی اسی غیر معمولی شخصیت اور موجود الوقت ظروف واحوال کے اعتبار سے بالکل اجنبی اور انوکھی سیرت کا نتیجہ ہے کہ آزادئ ہند اور تقسیم برصغیر کے جملہ مؤرخین و مصنفین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عالمِ اسباب میں قیامِ پاکستان کا واحد سبب صرف ایک انسان ہے — اور وہ ہے محمد علی جناح! یہاں تک کہ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" (FREEDOM AT MIDNIGHT) کے مصنفوں نے تو، اِس کے باوجود کہ قائدِاعظم سے اُن کا بُغض وعناد کتاب کے بہت سے مقامات پر بالکل عریاں طور پر نظر آتا ہے، واضح طور پر حسرت بھرے انداز میں لکھا ہے کہ اگر وہ راز جو بمبئے کے ڈاکٹر پٹیل کی دراز میں مقفّل تھا کسی طرح فاش ہو جاتا تو برصغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی اور ہندوستان ہرگز تقسیم نہ ہوتا اِس لیے کہ وہ راز دراصل قائدِاعظم کا وہ اکیسرے تھا جس سے اُن کے پھیپھڑوں کا ٹی بی سے متاثر ہونا ظاہر ہُوا تھا۔ اِن مصنفوں کی رائے میں اگر اُس وقت اِس کا علم حکومتِ برطانیہ یا کانگریس کی لیڈرشپ کو ہو جاتا تو وہ آزادئ ہند کو مؤخر کر دیتے اور قائدِاعظم کے انتقال کا انتظار کر لیتے، اِس لیے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ مسلمانانِ ہند کے پاس کوئی دوسرا 'قائد' ایسا موجود نہ تھا جسے نہ دھوکہ یا فریب دیا جا سکتا ہو، نہ مرعوب و متأثر کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی خریدا جا سکتا ہو!

اب اگر یہ بات درست ہے اور عربی مقولہ "اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ" کے مطابق اسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں تو ظاہر ہے کہ موجود الوقت معیارات اور ظروف واحوال کی نسبت سے اِتنی غیر معمولی اور اپنے ہمعصر لوگوں سے اِس درجہ مختلف شخصیت اللہ تعالےٰ کے کسی ارادۂ خصوصی ہی کا مظہر ہو سکتی ہے!!

باب ہشتم

نُصرت و حفاظتِ خداوندی

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کے لگ بھگ انتالیس[۳۹] سالوں کے دوران بھی متعدد مواقع پر پاکستان کی حفاظت و صیانت جس طرح ایک نادیدہ مگر قوی ہاتھ نے بالکل اِس انداز میں کی کہ ع "دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است!" تو یہ بھی ایک واضح اور مبیّن ثبوت ہے اِس کا کہ قدرت کو پاکستان کی بقا اپنے کسی منصوبے کی تکمیل کے لیے مطلوب ہے!

اِس ضمن میں اوّلاً قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی پہاڑ ایسی مشکلات اور حد درجہ پیچیدہ مسائل کا تصوّر کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ قطعاً بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان نے اُن کا مقابلہ و مواجہہ جس کامیابی کے ساتھ کیا، اُس کا اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و نصرت کے بغیر قطعاً کوئی امکان نہ تھا!

مشترکہ دفاع کی پیشکش

خاص طور پر ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے فوراً بعد جبکہ بھارت انتہائی ذِلّت و خفّت کے ساتھ اپنے زخم چاٹ رہا تھا، سابق صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان کی جانب سے بھارت کو 'مشترکہ دفاع' کی پیشکش کے معاملے پر غور کیا جائے تو ایک بار پھر کیبنٹ مشن پلان والا معاملہ نظر آتا ہے — پاکستان پر اُس وقت تک ایوب خان کی گرفت بہت مضبوط تھی اور کم از کم بظاہر احوال اندرونِ ملک اِس تجویز پر کسی شدید ردِّ عمل کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور اِس تجویز پر عمل درآمد کے معنی قطعی طور پر یہ تھے کہ گویا ہم ایک بار پھر آزاد و خود مختار پاکستان سے از خود دستبردار ہو کر سجدۂ سہو ادا کرتے ہوئے کیبنٹ مشن پلان ہی کی جانب رجوع

کر رہے ہیں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی وہ بات درست تھی جو میاں محمد شفیع (م۔ش) کی روایت کے مطابق مولانا نے کچھ بھارتی ہندوؤں سے تسلی آمیز انداز میں کہی تھی کہ "پاکستان کے قیام کو 'گئو ماتا' کے ٹکڑے ہونے کے مترادف نہ سمجھو بلکہ یوں سمجھو کہ بھارت کی گئو ماتا نے ایک بچہ دیا ہے جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے بالکل اُسی طرح چلے گا، جیسے بچھڑا گائے کے پیچھے پھرتا ہے!"

اِس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ پیش کش تو صرف 'مشترکہ دفاع' کی تھی اس سے کیبنٹ مشن پلان کی طرف رجوع کیسے ثابت ہو گیا جس میں پورے ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت تجویز کی گئی تھی ـــــ اِس لیے کہ مشترکہ دفاع کے مضمرات اور مقدرات کا جائزہ لیا جائے تو اوّلاً ـــــ اِس کا لازمی مطلب مشترک خارجہ پالیسی ہے ـــــ اور ثانیاً چونکہ قومی بجٹ کا سب سے بڑا حصّہ دفاع سے متعلق ہوتا ہے لہٰذا مشترک دفاع کا لازمی نتیجہ مشترک بجٹ بھی ہے۔ اِس طرح مشترکہ دفاع میں وہ جملہ اُمور مضمر تھے جو کیبنٹ مشن کی تجویز کے مطابق 'انڈین یونین' کو تفویض ہونے تھے سوائے مواصلات کے جو بہرصورت دفاع اور خارجہ اُمور کے مقابلے میں بہت ہی 'معصوم' سا معاملہ ہے ـــــ مزید برآں جنگ کی صورت میں چونکہ ذرائع رسل و رسائل اور وسائلِ حمل و نقل بھی لازماً دفاعی مشینری کا جزوِ لاینفک بن جاتے ہیں لہٰذا وہ بھی مشترکہ دفاع کی تجویز میں از خود شامل ہیں۔ گویا اگر بھارت اِس تجویز کو قبول کر لیتا تو بالکل کیبنٹ مشن پلان والی صورت بن جاتی اور پاکستان کا آزاد و خود مختار وجود باقی نہ رہتا! ـــــ

اِس مرحلہ پر پھر مشیّت و قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور پنڈت نہرو ہی کے ذریعے ہُوا جنہوں نے نہایت رعونت کے ساتھ:

"COMMON DEFENCE AGAINST WHOME ?" کہتے ہوئے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ـــــ اور اِس طرح پاکستان کی آزادی و خود مختاری کی ناؤ بھنور سے نکل آئی اور بالکل ڈوبتے ڈوبتے بچی!

۱۹۶۵ء میں دشمنوں کی مرعوبیّت

پاکستان کے ایسے ہی 'معجزانہ' تحفظ کا نظارہ پوری دنیا نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر بچشم سر کر لیا تھا۔ بھارت نے جس تیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کیا تھا اُس کے پیشِ نظر بھارت کی فتح اور پاکستان کی شکست نہ صرف بھارت بلکہ اُس کے سرپرستوں کے نزدیک بھی اتنی قطعی اور یقینی تھی کہ بی بی سی نے نہ صرف یہ کہ سقوطِ لاہور کی خبر نشر کر دی تھی بلکہ اُس کا 'منظر' بھی دنیا کو ٹی وی پر دکھا دیا تھا!۔۔۔ اِدھر تقدیرِ الٰہی خندہ کناں تھی اور "سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ" (سورۃ انفال آیت ۱۲) "میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب پیدا کر دوں گا!" کا بھرپور اعادہ ہو گیا تھا اور دشمن کی افواج مزاحمت کی غیر متوقع حد تک کمی کی بنا پر اِس اندیشے اور خوف ہی میں مبتلا ہو کر ٹھٹک کر رُکی رہ گئی تھیں کہ کہیں ہمیں کسی خوفناک نرغے میں نہ لیا جا رہا ہو!!

۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان کی حفاظت

یہ درست ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ہمیں قیامِ پاکستان کے اصل مقصد سے انحراف اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی سزا بھی بھرپور ملی۔ اور بھارت کے ہاتھوں ایک ذلت آمیز شکست کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے مشرقی بازو کی علیحدگی کا صدمہ بھی جھیلنا پڑا لیکن اِس موقع پر بھی مغربی پاکستان کا بچ جانا خالص آسمانی تدبیر کے ذریعے ہُوا۔۔۔ ورنہ جائزہ لیجیے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت کا مورال (MORALE) کس طرح ایک دم آسمان پر پہنچ گیا تھا، جبکہ ہمارا مورال 'اسفل سافلین' کے مصداق پاتال میں پہنچ گیا تھا ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور آفیسر بھارت کے اسیر ہو چکے تھے اور ہمارا کثیر تعداد میں اسلحہ اور دوسرا جنگی ساز و سامان بھارت کے قبضے میں آ گیا تھا۔۔۔ اور اب بھارت مشرقی محاذ سے فارغ ہو کر اپنی پوری عسکری قوت کو کامل یکسوئی کے ساتھ مغربی محاذ

پر جھونک سکتا تھا ـــــ اِدھر ہمارا حال یہ تھا کہ ایئر فورس تقریباً مفلوج ہو چکی تھی، نیوی 'لنگر انداز' تھی اور کیماڑی کی بندرگاہ تک دشمن کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہی تھی ـــــ رہے میدانی محاذ! تو دو محاذوں پر بھارت کی پیش قدمی جاری تھی یعنی راجستھان میں بھی اور سیالکوٹ کی جانب بھی، ـــــ لے دے کر صرف ایک سلیمانکی سیکٹر تھا جس میں ہماری 'ٹاسک فورس' برقرار (INTACT) تھی! ان حالات میں محتاط ترین اندازے کے مطابق مغربی پاکستان بھارت کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ دن کی بات تھی!

اِس مرحلے پر پھر اللہ تعالےٰ کی خصوصی مشیّت کا ظہور ہُوا اور امریکی صدر نکسن نے ہاٹ لائن پر روسی لیڈروں کو وارننگ دی اور اُن کے 'حکم' پر اندرا گاندھی نے "یک طرفہ جنگ بندی" کا اعلان کر دیا! ـــــ اور حال ہی کی بات ہے کہ صدر نکسن نے انکشاف کیا ہے کہ اُس موقع پر ہم ایٹمی قوت تک کے استعمال کے بارے میں سوچ رہے تھے! ـــــ کم از کم راقم الحروف کو تو شدید احساس ہے کہ اُس موقع پر یہ 'بچا کھچا' پاکستان بھی بالکل اُس طور پر بچا تھا جس طرح کبھی کسی انسان کے بالکل برابر سے کوئی تیز کار یا ٹرک زناٹے کے ساتھ اِس طرح گذر جائے کہ موت اور زندگی میں بال بھر کا فاصلہ رہ جائے اور انسان یہ محسوس کرے کہ جیسے فی الواقع اُسے کسی نادیدہ ہاتھ نے ایک طرف کو دھکیل کر بچایا ہے!!

۱۹۸۳ء کے اندرونِ سندھ کے ہنگامے

پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی نے اگرچہ اپنے والد کو تو 'صوفی' ہونے کا لقب دیا تھا لیکن خود اُس کی دستبُرد سے اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو اُس ہی کی 'چُوک' کے ذریعہ جس طرح بچایا اُس کا تلخ مزا اُس کے ذائقے میں دیر تک برقرار رہا ہوگا! ـــــ ۱۹۸۳ء کے دوران اندرونِ سندھ کے ہنگامے اپنی وسعت و شدّت اور تیزی و تندی ہر اعتبار سے اکثر لوگوں کے نزدیک حیران کُن اور تعجب خیز تھے۔ اُس وقت اگر براہِ راست مداخلت نہ سہی ذرا سی مدد بھی بھارت کی جانب سے

ہنگامہ کرنے والوں کو مِل جاتی تو پاکستان کا وجود شدید خطرے میں پڑ جاتا! —— اِس لیے کہ پاکستان کا وہ علاقہ جو ہنگاموں سے متاثر تھا، بالخصوص میرپور ماتھیلو سے خیرپور میرس تک کی پٹی پاکستان کے جسم کے نرم و نازک 'پیٹ' (SOFT UNDERBELLY) کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں اگر دو چار جگہوں پر ریلوے لائن اور ہائی وے کو کاٹ دیا جاتا تو گویا پاکستان کی شہ رگ (LIFE LINE) کٹ کر رہ جاتی۔ چنانچہ اُن ہنگاموں کے دوران اِس کی خبریں تو متعدد بار آئیں کہ گھوٹکی ریلوے اسٹیشن کو جلانے کے علاوہ متعدد مقامات پر ریل کی پٹڑیوں کو اکھاڑنے اور سلیپروں کو جلانے کی کوشش کی گئی لیکن کہیں سے اِس کی اطلاع نہیں ملی کہ ریلوے لائن کو ڈائنامائٹ سے اُڑانے کی سعی کی گئی ہو —— گویا وہاں جو کچھ ہُوا خالص دیسی یا 'خانہ زاد' (INDIGENOUS) وسائل سے ہُوا، بیرونی مداخلت یا امداد قطعاً موجود نہیں تھی —— گویا مسز اندرا گاندھی صرف یہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں کہ ہنگامے ذرا اور پھیل جائیں اور مداخلت کا واضح جواز پیدا ہو جائے تو اقدام کیا جائے —— اور اِدھر پاکستان کی فوج اور دوسرے دفاعی و حفاظتی اداروں نے ہنگاموں پر قابو پا لیا —— بعد میں وہ ابھی اپنی اِس 'چُوک' کی تلافی کے لیے کسی بھرپور اقدام کی اسکیم بنا ہی رہی تھیں کہ خود اُن کی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا ——

الغرض! —— نہ پاکستان کا قیام حالات و واقعات کی معمول (ROUTINE) کے مطابق پیش رفت کا نتیجہ تھا نہ اِس بچے کھچے پاکستان کا اب تک قائم رہنا کسی عام حساب کتاب کے مطابق ہے بلکہ اصل پاکستان کا ظہور و قیام بھی ایک 'معجزہ' تھا اور موجودہ پاکستان کی تا حال حفاظت و صیانت بھی اسباب و عِلل کے عام سلسلے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی خصوصی تدبیر و تصرّف ہی کی مرہونِ منت ہے ——

"جن کے رُتبے ہیں سِوا . . . ."

رہا یہ سوال کہ پاکستان کے قیام اور بقا سے تدبیرِ الٰہی کا کون سا طویل المیعاد منصوبہ متعلق ہے تو اِس کے بارے میں تو گفتگو ان شاء اللہ آئندہ ہوگی — موجودہ بحث کے تکملہ کے طور پر اِس حقیقت کی جانب توجہ دلانی ضروری ہے کہ اِس عام قاعدۂ کلّیہ کے مطابق کہ "جن کے رُتبے ہیں سِوا، ان کی سِوا مشکل ہے!" اور اللہ تعالیٰ کی اُس مستقل سُنّت کی رُو سے کہ "اگر تم ہمارے (انعامات پر) قدر شناسی اور احسان مندی کی روِش اختیار کرو گے تو ہم تمہیں مزید نوازیں گے، اور اگر تم نے ناقدری اور کفرانِ نعمت کا رویّہ اختیار کیا تو (جان لو کہ) ہماری سزا بھی بہت سخت ہوتی ہے!" (سورۂ ابراہیمؑ آیت ۷) مسلمانانِ پاکستان بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بڑے سخت امتحان اور کڑی آزمائش سے دوچار ہیں اور ہر حساب و کتاب سے ماوراء اور بڑی سے بڑی توقعات سے بھی بڑھ کر جو احسانِ عظیم قدرت نے کیا تھا اُس کی ناقدری و ناشکری اور صریح وعدہ خلافی پر سزا کا ایک بہت سخت کوڑا مشرقی پاکستان کے سقوط اور وہاں انتہائی ذِلّت آمیز شکست کی صورت میں ہماری پیٹھ پر پڑ چکا ہے — تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اُس قانون کا مظہر ہے کہ: "ہم اُنہیں (آخری اور) بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے، شاید کہ یہ (اپنی روِش سے) باز آجائیں!" (سورۃ سجدہ آیت ۲۱) کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی آخری سزا نہیں دی اور تلافیٔ مافات کی مہلت عطا کی ہوئی ہے۔ اِس لیے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ہرگز کوئی حقیر شے نہیں ہے بلکہ وسائل اور امکانات کے اعتبار سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ابھی مشرقی پاکستان بھی نام کی تبدیلی کے باوجود ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اُن ہی حدود کے ساتھ دنیا کے نقشے پر قائم ہے جن کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں اُس کا ظہور ہوا تھا — گویا ابھی موقع ہے کہ اگر جگرؔ کے اِس شعر کے مطابق کہ: —

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی!
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

—— ہم اپنی روش کو اُس آسمانی منصوبے کے مطابق اور موافق بنالیں جس کی ایک کڑی پاکستان کا قیام ہے تو کوئی عجب نہیں کہ برصغیر کے اُس گوشے میں اِسلام کا از سرِ نو تمکن و استحکام، جہاں آج سے تیرہ سو سال قبل صنم خانۂ ہند کا اوّلین، دارالاسلام، قائم ہُوا تھا، اُس کے کسی نئے عروج کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ ع

"رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں!"

بصورتِ دیگر ہمارا حشر اُس شخص کا سا ہوگا جس کا ذکر سورۂ اعراف کی آیات ۱۷۵، ۱۷۶ میں آیا ہے۔ "جسے ہم نے اپنی (خاص) نشانیاں عطا کی تھیں مگر وہ اُن سے بھاگ نکلا، تو پیچھے لگ گیا اُس کے شیطان اور شامل ہو کر رہا وہ سخت گمراہوں میں۔ اور اگر ہم چاہتے تو اُسے اپنی نشانیوں کے طفیل رفعتوں کا مکین بنا دیتے مگر وہ (بدبخت) تو زمین ہی کی جانب جھکتا چلا گیا!" —— گویا اِس صورت میں اندیشہ ہے کہ ع

"ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!"

عیاذاً باللہ ——!!

بقیہ: از صفحہ ۵۴

ذریعہ قرآنِ حکیم کی جانب از سرِ نو رجوع والتفات کے سوا اور کوئی نہیں، اور دوسرے یہ کہ گذشتہ چار صدیوں کے دوران جملہ تجدیدی مساعی کا اصل مرکز و معہد برصغیر پاک و ہند رہا ہے! —— البتہ یہ بات صرف گمانِ غالب کے درجے میں ہے کہ اب اِس سلسلے کے تکمیلی اقدام کے لیے مشیّتِ ایزدی نے ارضِ پاک کو چُن لیا ہے! —— لیکن یہ بات چونکہ تفصیل طلب ہے لہٰذا اس پر ہمیں مفصّل گفتگو کرنا ہوگی!

باب نہم

اسلام کا عالمی غلبہ
— اور پاکستان

پاکستان کا 'معجزانہ قیام' — قائدِ اعظم کی غیر معمولی قیادت اور پاکستان کی تاحال خصوصی حفاظت وصیانت کی صرف ایک توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔!

اِس 'قضیے' (PROPOSITION) یا نظریئے (THEORUM) کے دو اجزاء ہیں: ایک یہ کہ بالآخر اسلام پوری دنیا پر غالب آکر رہے گا اور پورے کرۂ ارضی پر اسلام کی حکمرانی قائم ہو کر رہے گی! — اور دوسرا یہ کہ اسلام کے اِس عالمی غلبے (GLOBAL DOMINATION) میں ایک اہم اور فیصلہ کن کردار (CRUCIAL ROLE) پاکستان کو ادا کرنا ہے اور یہ گویا پاکستان کی تقدیر (DESTINY) ہے!

اِن میں سے جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے، وہ بالکل یقینی اور اٹل ہے اِس لیے کہ وہ قرآنِ حکیم سے بھی دلالۃً (BY INFERENCE) ثابت ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ میں تو صراحتہً مذکور ہے اور اِس کے ضمن میں گمان اور قیاس کا معاملہ صرف اِس مسئلے تک محدود ہے کہ ایسا کب ہوگا؟ — البتہ جہاں تک دوسرے جزو کا تعلق ہے تو وہ سراسر یا قیاس وگمان کا معاملہ ہے یا ذوق ووجدان کا۔ چنانچہ اِس کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم اِن سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا گمانِ غالب یہی ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز یہی سرزمین بنے گی جس کا نام 'پاکستان' ہے۔ گویا راقم کو علامہ اقبال کے اِس شعر سے اتفاق ہے کہ:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

واللہ اعلم!—

اسلام کے عالمی غلبے کی پیشین گوئی

اِسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں قرآنِ حکیم میں وارد شدہ 'صغریٰ' اور 'کبر ...' (PREMISES) سے جو لازمی اور منطقی نتیجہ حاصل ہوتا ہے اُسی کی صریح اور ... ع خبر پیشنگوئیوں کی صورت میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متعدد احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ عمل آپؐ کے اِس فرضِ منصبی کا مظہر ہے کہ آپؐ قرآنِ حکیم کے مضمرات اور اشارات کو کھول کر بیان فرمائیں۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورۃ النحل آیت ۴۴)

"اے محمدؐ) ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپؐ کی جانب اِس لیے نازل فرمایا ہے کہ آپؐ وضاحت فرمائیں لوگوں کے لیے اُس چیز کی جو اُن کی جانب نازل کی گئی ہے!"

بعثتِ محمدیؐ کا لازمی نتیجہ: دینِ حق کا غلبہ

اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں قرآنِ حکیم کا 'صُغریٰ' اور 'کُبریٰ' یہ ہے:

(۱) قرآنِ حکیم میں مندرجہ ذیل الفاظ تین مقامات پر بغیر ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے ہیں:

"هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ"
(سورۃ توبہ آیت ۳۳، سورہ فتح آیت ۲۸ سورہ صف آیت ۹)

(ترجمہ) "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل کے کُل دین (یا تمام ادیان) پر اِسے"

— گویا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد غلبۂ اسلام ہے، خواہ یوں کہہ لیا جائے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے اِس اٹل فیصلے کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ آپؐ کے ذریعے دینِ حق یعنی اسلام کی صرف تبلیغ و دعوت ہی نہیں ہوگی بلکہ اسلام کو بالفعل غلبہ و استیلاء حاصل ہو کر رہے گا، بہر صورت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسلام کا بالفعل غلبہ قرآن حکیم کی نصِ قطعی سے صراحتہً ثابت ہے!

(۲) دوسری طرف قرآن مجید نے ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق مختلف اسالیب سے اِس حقیقت کو مبرہن اور واشگاف کر دیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کسی خاص قوم یا علاقے کی طرف نہیں بلکہ عالمی اور آفاقی ہے۔ اور پوری نسلِ انسانی آپؐ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہے۔ چنانچہ کہیں اِس حقیقت کو اِس طور سے بیان فرمایا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (سورۃ انبیاء آیت)

"ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام جہانوں (یا تمام جہان والوں) کے لیے رحمت بنا کر!"

(واضح رہے کہ "عَالَمِیْنَ" کا ترجمہ "تمام جہانوں" کے علاوہ عربی گرامر کے اس اصول کے مطابق کہ کبھی ظرف کی جمع سے مراد مظروف کی جمع ہوتی ہے "تمام جہانوں والے" بھی ممکن ہے!) کہیں یہ بات اِس انداز میں بیان ہوئی کہ آپؐ اگرچہ خود "اُمّیین" یعنی بنی اسمٰعیلؑ میں سے ہیں لیکن آپؐ کی بعثت صرف اُن کی جانب ہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ "آخرین" یعنی دوسروں کی طرف بھی ہے!

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول اُنہی میں کا پڑھ کر سناتا ہے اُن کو اُس کی آیتیں اور اُن کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے اُن کو کتاب اور عقلمندی اور اِس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں اور اُٹھایا اُس رسول کو ایک دوسرے لوگوں کے واسطے بھی اُنہی میں سے جو ابھی نہیں ملے اُن میں اور وہی

(سورہ جمعہ آیات ۲/۳) ہے زبردست حکمت والا!"

—— اور کہیں بالکل صاف اور صریح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً (ترجمہ) "ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر
لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر
(سورۂ سبا: آیت ۲۸) بنا کر!"

قرآنِ حکیم کے اِس صغریٰ و کُبریٰ کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا غلبہ پورے عالمِ انسانی اور کُل کرۂ ارضی پر ہو کر رہے گا اور یہ وہ تقدیرِ مُبرم ہے جو کسی صورت ٹل نہیں سکتی، بقول اقبالؔ ؎

تقدیر تو مُبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

البتہ چونکہ قرآنِ حکیم کے اِس اٹل فیصلے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان کو کسی قدر منطق اور استدلال سے کام لینا پڑتا ہے لہٰذا اللہ تعالےٰ کے اس مستقل فرمان کے مطابق جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے اِس کی صریح اور واضح الفاظ میں خبر دی ہے جناب صادق و مصدوق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے!

احادیثِ صحیحہ میں غلبۂ اسلام کی پیشینگوئیاں

(۱) امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مُسند میں حضرت مقداد بن الاسودؓ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ: "رُوئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہُوا گھر رہ جائے گا نہ اُونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے! خواہ کسی سعادت مند کو عزّت دے کر خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے یعنی یا تو اللہ تعالےٰ لوگوں کو عزّت عطا فرما دے گا اور انہیں کلمۂ اسلام کا قائل و حامل بنا دے گا یا اُنہیں مغلوب فرما دے گا کہ اسلام کے محکوم بن جائیں!" حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ کے اِس قولِ مبارک پر مَیں نے اپنے دل میں کہا:

"پھر تو (واقعتہً) دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا!" (واضح رہے کہ حضرت مقداد رضؓ کے ان الفاظ میں اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت ۳۹ میں وارد شدہ اِن الفاظِ مبارکہ کی جانب کہ (ترجمہ) "اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے!")[1]

(۲) امام مسلمؒ نے حضرت ثوبان رضؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے لیے کُل زمین کو لپیٹ دیا گیا۔ چنانچہ میں نے اُس کے (تمام) مشارق و مغارب کو دیکھ لیا — اور یقیناً میری اُمّت کی حکومت اُس پوری زمین پر قائم ہو کر رہے گی جو میرے لیے لپیٹی گئی!"

راقم الحروف کے نزدیک قرآنِ حکیم کے ان واضح اشارات اور نبی اکرمؐ کی ان صریح پیشینگوئیوں کے بعد بھی اگر کسی کے دل میں اسلام کے عالمی غلبے کے بارے میں کوئی شک یا شبہ باقی رہے تو یہ ایمان کے فقدان یا کم از کم شدید ضعف کی علامت ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصریح

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف 'اِزالۃُ الخفا عَن خلافۃ الخلفاء' میں وجوبِ قیامِ خلافت پر بحث کرتے ہوئے جہاں بعض دوسری آیات کا بھی حوالہ دیا ہے وہاں سورۂ توبہ، سورۂ فتح، اور سورۂ صف کی محولہ بالا آیت پر تفصیلاً بحث کی ہے، — اور اس کے اصل مفہوم کو متذکرہ بالا احادیث کی روشنی میں واضح کیا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ بالآخر پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ اُسی طرح ہو کر رہے گا جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جزیرہ نمائے عرب پر ہو گیا تھا!

---

[1] وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

مفکّر و مصوّرِ پاکستان کی پیش بینی

اور یقیناً علّامہ اقبال مرحوم نے بھی ؎ "آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی۔ دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!" کے مصداق باطن کی آنکھ سے اُسی "آنے والے دَور کی دھندلی سی اِک تصویر" دیکھ لی تھی جب یہ فرمایا تھا کہ: ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

تاریخ کا رُخ

علّامہ اقبال نے ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں ابلیس کی زبانی ایک عظیم حقیقت کی نشاندہی فرمائی ہے — یعنی ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے
مزدکیّت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

اِس لیے کہ ہر وہ شخص جو "آفاق میں گم" ہو جانے کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو اور ذاتی مسائل و معاملات سے قدرے بلند تر سطح پر تاریخ انسانی کے بہاؤ کے رُخ کا مشاہدہ کر سکتا ہو بادنیٰ تأمل دیکھ سکتا ہے کہ واقعۃً تاریخ کا رُخ اسلام کے عالمی غلبے ہی کی جانب ہے اور قافلۂ انسانی اسی سمت میں رواں دواں ہے!! — اس لیے کہ ایک طرف طبیعاتی علوم (PHYSICAL SCIENCES) ہیں جو درجہ بدرجہ

کثرت سے وحدت، گویا شرک سے توحید کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں، دوسری طرف عمرانیات (SOCIAL SCIENCES) ہیں جن کی تحقیق و جستجو چار و ناچار اُسی رُخ پر آگے بڑھ رہی ہے کہ ابلیس کو اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

گویا قافلۂ انسانیت کشاں کشاں "بمصطفیٰؐ برساں خویش" پر عمل پیرا ہے اور اجتماعیات انسانیہ کے ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

تیسری طرف اُمّتِ مُسلمہ دو بار عروج اور دو بار زوال سے دو چار ہونے کے بعد اب ایک تیسرے عروج کی جانب پرواز کے لیے پَر تول رہی ہے! جس کے اندیشے ابلیسی تہذیب کے جملہ مراکز میں شدّت کے ساتھ محسوس ہو رہے ہیں۔ چنانچہ کہیں "اسلامی بنیاد پرستی" (ISLAMIC FUNDAMENTALISM) کو گالیاں دی جا رہی ہیں تو کہیں "جارحیت پسندانہ اسلام کی پیش قدمی!" ("MILITANT ISLAM ON THE MARCH") کی دہائی دی جا رہی ہے!

ہماری اِس وقت کی بحث کے اعتبار سے اِس آخری نکتے کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے اور اِس سلسلے میں ایک حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں چند آیاتِ قرآنیہ پر تدبّر نہایت مفید ہوگا! جس سے اِن شاء اللہ نہ صرف اِس حقیقت پر یقین و اعتماد میں اضافہ ہوگا کہ ؎

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

بلکہ اضافی طور پر علم و حکمتِ قرآنی کا ایک اور گراں بہا موتی ہاتھ آئے گا! اور غلبۂ

اسلام اور اُمتِ مُسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے عملی اقدام کی جانب اہم رہنمائی ملے گی!

تاریخ بنی اسرائیل کے چار اَدوار

اِس کتاب کے مقدمے میں اُس حدیثِ نبویؐ کا ذکر آچکا ہے جسے امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضؓ سے روایت کیا ہے اور جس کی رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال لازماً وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جُوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے!" اِس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں غور فرمایئے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۹ پر جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	"اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنی)
فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي	کتاب میں (پہلے ہی) متنبہ کر دیا تھا
الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ	کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا	کرو گے اور بڑی سرکشی کا مظاہرہ
جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا	کرو گے! تو جب آن پہنچا اُن دو
بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ	مواقع میں سے پہلے کا وقت تو مسلّط
اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ	کر دیئے ہم نے تم پر اپنے نہایت جنگجو
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ	بندے جو گھس گئے ہر جانب تمہاری
وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝	آبادیوں میں اِس طرح وہ اٹل وعدہ پورا
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ	ہو کر رہا۔ پھر ہم نے لوٹائی تمہاری باری
عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ	اُن پر اور مدد کی تمہاری اموال و اولاد
بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ	سے اور کر دی تمہاری تعداد بہت کثیر
اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ	اگر تم نے بھلا کیا تو اپنے ہی لیے کیا اور
اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۖ	اگر بُرا کیا تو بھی اپنے ہی لیے! پھر جب
وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ	آن پہنچا دوسرے وعدہ کا وقت تو

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

ہم نے پھر کسی قوم کو تم پر مسلط کیا) تاکہ وہ بگاڑ دیں تمہارے چہرے اور گھس جائیں مسجد (ہیکل سلیمانی) میں جیسے گھسے تھے پہلی بار، اور تہس نہس کر ڈالیں ہر اُس چیز کو جس پر اُن کو قابو حاصل ہو جائے"۔ (اب بھی) بعید نہیں کہ تمہارا ربّ تم پر رحم فرمائے لیکن اگر تم پھر وہی روش اختیار کرو گے تو ہم بھی دوبارہ پہلی سی سزا دیں گے، (رہی آخرت تو اُس میں تو) ہم نے جہنّم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہی ہُوا ہے، یقیناً یہ قرآن رہنمائی فرماتا ہے سب سے سیدھی راہ کی جانب اور بشارت دیتا ہے اُن ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال (بھی) کریں کہ اُن کے لیے ہے بہت بڑا اجر و ثواب!"

ان آیاتِ مبارکہ سے تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن میں حسبِ ذیل حقائق واضح ہوتے ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دَور گذر چکے تھے: دو دَورِ عروج کے جن کے دوران اُن کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور اُنہیں دنیا میں عزّت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور رہے ــــ اور دو دَورِ زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی،

نتیجتہً اُن پر اللہ کا غضب نازل ہُوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے اور اُن کے دینی و رُوحانی مرکز یعنی ہیکل سلیمانی کی حُرمت بھی پامال ہوئی۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن حکیم کے نزول کی صورت میں اللہ تعالےٰ نے اُن کے لیے ایک بیسرے عروج کا موقع عنایت فرمایا کہ ان کا دامن تھام کر اللہ کی رحمت کے سائے میں آجائیں، ساتھ ہی یہ وعید بھی سُنادی گئی کہ اگر اس سے اعراض و انکار کی روش اختیار کریں گے تو عذابِ الٰہی کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔!

قرآنِ حکیم کے اِن اشارات کی روشنی میں تاریخ بنی اسرائیل کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل چار ادوار اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں :

۱۔ اُن کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع بن نُون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہُوا اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہُوا یہ دورِ سعادت حضرتِ داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ حضرت سلیمان ؑ کے انتقال کے ساتھ ہی اُن کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہوگیا اِس لیے کہ فوراً ہی اُن کی سلطنت دو حصّوں میں منقسم ہوگئی۔ بہرحال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچا۔ چنانچہ اس کے دوران اوّلاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنتِ اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ء قبل مسیح ؑ میں مشرق (عراق) سے آنے والے بوکدنضر کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنتِ یہودیہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں افراد کو قتل کیا چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلّوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکلِ سلیمانی کو کلیتہً مسمار کردیا

حتیٰ کہ اُس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! ـــــ بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری (CAPTIVITY) کا دَور بنی اسرائیل کی ذلّت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے!

۳۔ بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرتِ مسیحؑ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرتِ عزیر علیہ السّلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دَور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا اور اِس کا مظہرِ اعظم وہ مکابی سلطنت تھی، جو تقریباً ۱۶۰ ق م سے ۶۳ ق م تک نہایت دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے دَور کی یاد تازہ کر دی!

۴۔ بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال ۶۳ ق م میں رومی فاتح پومپئی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تاحال جاری ہے۔ اِس کے دوران اوّلاً حضرت مسیح علیہ السّلام کی دعوت سے اعراض و انکار اور اُن کی شدید دشمنی اور مخالفت کی سزا ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس کے ذریعے ملی جس نے دوبارہ یروشلم کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو تہہ تیغ کیا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنا لیا ـــــ اِس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اُن پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برستے رہے جن میں تازہ ترین جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں اُن کا قتلِ عام ہے جس کی یاد وہ 'HOLOCAUST' نامی کلچر کے ذریعے وقتاً فوقتاً تازہ کرتے رہتے ہیں

۵۔ حضرتِ مسیح علیہ السّلام کے ساتھ یہود کے طرزِ عمل کی بنا پر جو مستقل ذلّت و مسکنت اُن پر مسلّط کر دی گئی تھی اُس سے رستگاری حاصل کرنے کا جو موقع انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں " اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ " کے مطابق جنابِ رحمۃ اللعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دامانِ رحمت کے سائے میں آ جانے اور رحمان کی رحمانیت کے مظہرِ اتم اور حبل اللہ المتین کے مصداقِ کامل قرآن کو مضبوطی

سے تھام لینے کی صورت میں ملا تھا اُسے تو انہوں نے اپنے تکبر و غرور کی بنا پر کھو دیا تھا — اب بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں " حَبْلٍ مِّنَ النَّاس " کے مطابق مغربی سامراج کے سہارے اُن کی جو سلطنت قائم ہوئی ہے، قرآنِ حکیم کے اشارات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح پیشینگوئیوں پر یقین رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کی اصل حیثیت گُل ہونے والے شعلے کی آخری بھڑک اور قریب المرگ مریض کے آخری سنبھالے کے سوا کچھ نہیں اور قدرتِ خداوندی نے موجودہ سلطنتِ اسرائیل کے ذریعے تمام یہودیوں کو رُوئے ارضی کے کونے کونے سے کھینچ کر ارضِ فلسطین میں جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے تاکہ اُن کا آخری استیصال (FINAL EXTERMINATION) اور اجتماعی تدفین (MASS BURRIAL) ایک ہی مقام پر بسہولت ہو جائے۔

گذشتہ چودہ سو سال
اور اُمتِ مسلمہ کے بھی دو عروج اور دو زوال

متذکرہ بالا حدیثِ نبویؐ، آیاتِ قرآنیہ اور تاریخِ بنی اسرائیل کی روشنی میں جب ہم اُمتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو فرمانِ رسولؐ کی معجزانہ صداقت کا ایک عجیب نقش دل پر قائم ہوتا ہے کہ اِس کے دوران میں بھی ہُوبہُو وہی دو بار عروج اور دو مرتبہ زوال کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ :

ا۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط

(سورۃ آل عمران، آیت ۱۱۲)

" جمادی گئی اُن پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعے سے جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعے سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے غضبِ الٰہی کے اور جمادی گئی اُن پر پستی ! "

۱۔ اُمتِ مُسلمہ کا پہلا دورِ عروج "اُمیّین" کی زیرِ سرکردگی لگ بھگ تین ہی صدیوں پر پھیلا ہُوا تھا۔ اِس لیے کہ اگرچہ ویسے تو دورِ خلافتِ راشدہ، دورِ بنی اُمیہ اور دورِ بنی عباس کی مجموعی مدّت سوا چھ سو سال بنتی ہے لیکن اِس میں سے اصل دبدبہ، مرکزیت اور خالص عربی شوکت وسطوت کا دور تین سو سال ہی کو محیط ہے۔

۲۔ اُس کے بعد کے چار سو سال زوال کے دورِ اوّل پر مشتمل ہیں۔ عجیب حیرتناک مشابہت ہے کہ اِس کے 'نقطۂ عروج' پر بھی بالکل وہی صورت نظر آتی ہے کہ اوّلاً شمال سے صلیبیوں کا سیلاب آیا، جس نے شام کے ساحلی علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور ۱۰۹۹ء میں یروشلم کو فتح کر کے مسجدِ اقصےٰ کی حُرمت بھی پامال کی اور لاکھوں مسلمانوں کو بھی تہہِ تیغ کیا۔ اور پھر مشرق سے تاتاریوں کا سیلاب آیا جس کے دوران نہ صرف یہ کہ لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے، بلکہ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافتِ عباسیہ کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔

۳۔ اِس کے بعد پھر ایک دورِ عروج آیا۔ لیکن "اُمیّین" یعنی عربوں کی زیرِ قیادت نہیں بلکہ "آخرین" یعنی غیر عرب اقوام میں سے ایک نہایت قوی اور توانا قوم کی زیرِ قیادت جسے اللہ نے سورۂ محمدؐ کی آخری آیت میں وارد شدہ الفاظ یعنی (ترجمہ) "اگر تم پیٹھ دکھاؤ گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا!" کے مطابق پسند فرمایا۔ چنانچہ اللہ نے پہلے اُنہیں مسلمانوں کی پیٹھ پر عذاب کے کوڑے کے طور پر استعمال فرمایا اور بعد ازاں اُنہی کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی توفیق دے دی بلکہ عالمِ اسلام کی قیادت بھی اُنہی کے حوالے کر دی ؎ بقول اقبال ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ اوّلاً تُرکانِ سلجوقی میدان میں آئے، پھر تُرکانِ صفوی، تُرکانِ تیموری اور تُرکانِ عثمانی جن کے ہاتھوں عظیم سلطنتوں کی بنیاد پڑی —— اور تُرکانِ عثمانی کی

سعادت کا تو کہنا ہی کیا کہ نہ صرف یہ کہ پورے جنوبی ایشیا، شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ پر اُن کی شوکت و سطوت کا سِکّہ جما بلکہ خلافتِ اسلامی کا عَلَم بھی کئی صدیوں تک اُن کے ہاتھوں میں رہا!

۴۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال دو یورپی قوموں یونانیوں اور رُومیوں کے ہاتھوں آیا تھا، اُمّتِ مسلمہ کا دوسرا دورِ زوال بھی یورپی استعمار کے سیلاب کے نتیجے میں ظاہر ہُوا۔ چنانچہ ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کی قوتوں سے مسلح ہو کر یورپی اقوام جب بیدار ہوئیں تو ایک عربی محاورے "سَمِّنْ کَلْبَکَ یَاْکُلْکَ" یعنی اپنے کتّے کو کھِلا پلا کر موٹا کرو گے تو ایک دن تم ہی کو کاٹے گا! کے مطابق انہوں نے اوّلاً دولتِ ہسپانیہ ہی کو ہڑپ کیا اور پھر ۱۴۹۸ء میں راس اُمید کے راستے کی دریافت کے بعد مغربی استعمار کا سیلاب اِس طویل بحری راستے کے ذریعے عالمِ اسلام کے دائیں بازو پر حملہ آور ہُوا ــــ اور یہ عمل موجودہ صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر تکمیل کو پہنچا جب عظیم سلطنتِ عثمانیہ کا نام و نشان مِٹ گیا اور صرف ایک چھوٹا سا ملک ترکی باقی رہ گیا، خلافتِ اسلامیہ کا چراغ گُل ہو گیا ــ اور پورا عالمِ اسلام یورپی اقوام کی براہِ راست یا بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا ــــ عجیب حیرت انگیز مماثلت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے اِس دوسرے دورِ زوال کے تتمّے کے طور پر ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کے عہدِ تولیت کے دوران بھی دوسری بار مسجدِ اقصیٰ کی حُرمت پامال ہوئی اور گزشتہ اٹھارہ برس سے مسلمانوں کا یہ قبلۂ اوّل ایک مغضوب و ملعون قوم کے قبضہ و تسلط میں ہے!

۵۔ جس طرح ایک انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا معاملہ ہے کہ جوانی کی قوّت و شدّت کی بنیادیں بچپن اور لڑکپن ہی میں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں اور بڑھاپے کے ضعف اور ناتوانی کی جڑیں عین جوانی کے عروج کے وقت جسمِ انسانی میں جمنی شروع ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح قوموں اور اُمّتوں کا معاملہ ہے کہ اُن کے بھی عین عروج کے وقت زوال کے عمل کا آغاز ہو چکا ہوتا ہے۔ دورِ زوال کی

انتہا کے ساتھ ہی عروج کی جانب حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب سے لگ بھگ پون صدی قبل جب ملّتِ اسلامیہ ہند کا ایک دردمند فرزند الطاف حسین حالی اُمّتِ مسلمہ کی پستی کی انتہا پر نالہ کناں تھا کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اِسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے — اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

عین اُسی وقت ایک دوسرا مردِ قلندر ملّتِ اسلامی اور اُمّتِ مسلمہ کے عروجِ تازہ کے خواب دیکھ رہا تھا اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ پیشین گوئی کر رہا تھا کہ ؎

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ نصف صدی قبل تاریخِ انسانی اُمّتِ مسلمہ کے ایک تیسرے دورِ عروج کی جانب سفر کا آغاز کر چکی ہے جس کے نتیجے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا وہ عمل جو الفِ ثانی کے تجدیدی کارنامے سے شروع ہوا تھا ان شاء اللہ اسلام کے غلبے پر منتج ہوگا — اور اس کے ضمن میں دو اُمور تو بالکل قطعی اور حتمی ہیں، یعنی ایک یہ کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷ کی رُو سے اِس کا فیصلہ کن

(باقی ص ۳۹ پر)

باب دھم

"الفِ ثانی" کی تجدیدی مساعی

اور برِّصغیر پاک وھند

اُمّتِ مسلمہ اپنی چودہ سوسالہ تاریخ کے دوران جس طرح دوؔ بار عروج سے ہمکنار ہوچکی ہے اور دوؔ ہی بار زوال سے دوچار ہوچکی ہے اُس کا ذکر ؎

" خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں !"

کے مصداق سابقہ اُمت کی تاریخ کے حوالے سے نہایت وضاحت کے ساتھ ہوچکا ہے۔ اب اس سے قبل کہ ہم اُس تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کا جائزہ لیں جس کا آغاز ہمارے مشاہدے کے مطابق تقریباً نصف صدی قبل ہوگیا تھا، آیئے کہ ایک طائرانہ نگاہ اسلام میں کارِ تجدید کی اہمیت و نوعیت اور خاص طور پر اُمتِ مُسلمہ کی تاریخ کے دوسرے ہزارسالہ دَور (الفِ ثانی) میں تجدید و احیاء کے اس عمل کے بالکلیّہ برِّصغیر پاک و ہند میں اِرتکاز پر ڈال لیں۔ تاکہ اس تاریخی تناظر میں پاکستان کے کردار (ROLE) کی اہمیت پورے طور پر واضح ہوجائے!

ختمِ نبوّت سے پیدا شدہ خلا اور اُس کی تلافی کا اہتمام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر نبوّت و رسالت کے درجۂ کمال کو پہنچ کر اختتام پذیر ہوجانے سے جو خلاءٔ پیدا ہُوا اُسے حکمتِ خداوندی نے اِس طرح پُر فرمایا کہ ؛

اوّلاً ـــــ ' الہدیٰ ' یعنی قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ نے اپنی ہدایت کو

کامل فرما دیا، یا یوں کہہ لیں کہ: "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ" (سورۂ صف: آیت نمبر ۸) ترجمہ "اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا" کے مصداق نورِ ہدایت کا اِتمام فرما دیا اور پھر اُس کی حفاظت کا ذمّہ بھی خود لے لیا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (ترجمہ) "ہم نے ہی اِس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم خود ہی اس کے محافظ ہیں!" (سورہ حجر آیت نمبر۹)

—— گویا اب کسی نئی وحی یا نئے نبی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہی، بلکہ صرف اُس "نوعِ انسان را پیامِ آخریں!" یعنی قرآنِ حکیم کی دعوت و اشاعت اور تبلیغ و تعلیم کا کام رہ گیا جس کی ذمّہ داری تا قیامِ قیامت اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ اِس کے لیے آنحضورؐ کی ترغیب و تشویق کی انتہا کا مظہر تو آپؐ کا یہ قولِ مبارک ہے کہ:

"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔!"[1]

—— اور تاکید کی انتہا آپؐ کے اِس فرمان سے ظاہر ہے کہ: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً" (ترجمہ) پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!"[2]

ثانیاً —— لگ بھگ ایک ایک صدی کے وقفہ سے ایسے عظیم مجدّدین کا سلسلہ جاری فرما دیا جو درمیانی وقفے کے دوران پیدا شدہ من گھڑت خیالات و عقائد اور نئی ایجاد شدہ بدعات و رسومات کا قلع قمع کر کے دینِ حق کی اصل تعلیمات کو از سرِ نو نکھار کر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے لاتے رہیں تاکہ ہدایتِ ربّانی کے رُوئے انور پر جمع ہو جانے والا گرد و غبار وقتاً فوقتاً صاف ہوتا ہے اور وہ خلقِ خدا کے سامنے اپنی اصل شان کے ساتھ جلوہ آرا ہوتا رہے اور اِس طرح ہدایت کے طالب اور حق کے متلاشی لوگوں کو دین کی حقیقی تعلیمات اور فلاح و سعادتِ دارین سے ہمکنار کرنے والے "صراطِ مستقیم" تک رسائی میں دقّت نہ ہو ——!

---

[1] رواہ البخاری رح عن عثمان رضؓ ابنِ عفّان

[2] رواہ البخاری رح عن عبداللہ رضؓ ابنِ عمر رضؓ

اِسی کے ذیل میں ایک اضافی ضمانت اِس امر کی بھی دے دی گئی کہ دنیا اہلِ حق سے کبھی بالکل خالی نہ ہو گی اور اُمّتِ محمدؐ میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت لازماً حق پر قائم رہے گی۔ (ان دونوں کے باہمی ربط سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ ہر دور کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ایک جماعت اہلِ حق کی وجود میں آتی رہے گی جو لگ بھگ ایک صدی تک خلقِ خدا کی صحیح راستے کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی —— تا آنکہ اِس عرصے میں وہ خود زوال سے دوچار ہو کر ایک 'فرقہ' بن جائے اور پھر اللہ کسی اور صاحبِ دعوت و عزیمت کو اِصلاح و تجدید کی توفیق عطا فرما کر کھڑا کر دے، واللہ اعلم)

کارِ تجدید اور سلسلۂ مجدّدین کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظِ مبارکہ سُنن ابی داؤد ؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں وہ یہ ہیں:

"اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ عَامٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا"

"اللہ تعالیٰ اِس اُمّت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے لوگوں کو اُٹھاتا رہے گا جو اُس کے لیے اُس کے دین کو از سرِ نو تازہ کرتے رہیں گے!"

اِس حدیث کی شرح و تفسیر میں دو ۲ اُمور پر علمائے اُمّت کا تقریباً اجماع ہے: ایک ۱ یہ کہ سو سال سے مراد لازماً یہی مدّت نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ صرف 'وقتاً فوقتاً' کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بطور محاورہ استعمال ہوئے ہیں، اور دو ۲ سرے یہ کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک صدی میں کوئی ایک ہی مجدّد ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں متعدّد اصحابِ ہمّت و عزیمت اِس کام کے کرنے والے موجود ہوں —— بایں ہمہ حدیثِ نبویؐ کے ظاہری الفاظ کی رعایت سے ہر صدی ہجری کے ضمن میں کسی ایسی اہم ترین اور عظیم ترین شخصیّت کی تعیین کی کوششیں بھی عموماً ہوتی رہی ہیں جسے اُس صدی کا مجدّد قرار دیا جا سکے!

'الفِ ثانی' کی تجدیدی مساعی

اِس تحریر میں ہمیں نہ اُمّتِ مُسلمہ کی تاریخ کے پہلے ایک ہزار سال کے دوران کے مجدّدین و مصلحین کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، نہ 'الفِ ثانی' کے مجدّدینِ اُمّت کی اصلاحی مساعی یا تجدیدی کارناموں کی تفصیل پیش کرنی ہے بلکہ مقصود صرف اِس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرانا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری سے یہ کارِ تجدید و اصلاح بالکلیہ برِّصغیر پاک و ہند میں مرتکز ہو گیا ہے!

اِس کی ایک ظاہری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ صورت بھی صرف اِس صنم خانۂ ہند ہی میں پیش آئی تھی کہ ؎

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر ہم غریبوں کی محبّت کا اڑایا ہے مذاق!"

کے مصداق 'مغلِ اعظم' شہنشاہ جلال الدّین اکبر علیہ ما علیہ نے کچھ اپنی سیاسی اور حکومتی مصلحتوں کی بنا پر اور کچھ سرکاری علماء اور درباری دانشوروں کے سکھانے پڑھانے پر یہ دعویٰ کر دیا کہ محمد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دین صرف ایک ہزار سال کے لیے تھا۔ لہٰذا اب اُس کی مدّت ختم ہو چکی ہے اور 'الفِ ثانی' یعنی دوسرے ہزار سال کے لیے ایک نیا دین درکار ہے۔ چنانچہ اُس نے 'دینِ الٰہی' کے نام سے وہ نیا مذہب ایجاد بھی کر لیا اور اُسے حکومت کی قوّت و اختیار کے بَل پر پھیلانا اور رائج کرنا بھی شروع کر دیا۔ اِس پر ع" درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!" کے عام قاعدۂ کلّیہ کے تحت رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور ؎

"خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری"

کے مصداق جلالِ فاروقی رضؓ شیخ احمد سرہندی رحؒ کی صورت میں ظاہر ہوا (واضح رہے کہ حضرتِ مجدّد رحؒ حضرت عمر رضؓ کی اولاد سے تھے!) جنہوں نے 'دینِ الٰہی' کے فتنے کا قلع قمع کر دیا اور اصل دینِ محمدیؐ کی از سرِ نو تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا چنانچہ پورے عالمِ اسلام میں وہ معروف ہی اپنے اصل نام سے زیادہ 'امامِ ربّانی مجدّد الفِ ثانی' کے لقب سے ہو گئے! —— بالکل اُسی طرح جس طرح غزوۂ بدر کے

لیے ابوجہل کے پیشگی طور پر استعمال کیے ہوئے لفظ 'یوم الفرقان' کو وحیِ ربّانی نے اُسی کے منہ پر دے مارا تھا اور "یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَان" کو واقعتہً "یَوْمَ الْفُرْقَان" ہی بنا دیا تھا (سورۂ انفال، آیت ۴۱) چنانچہ اب قیامت تک یومِ بدر یومِ فرقان ہی کے نام سے موسوم رہے گا!

گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی رح کے ساتھ ساتھ ایک دوسری اہم صاحبِ ہمّت و عزیمت شخصیت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی ہے — اور اس صدی کے دوران پورے عالمِ اسلام میں ان دونوں کی ٹکر کی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔

بارہویں صدی میں البتہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ساتھ ساتھ شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی رح کی شخصیت بھی نظر آتی ہے اور انہیں اِس بناء پر شہرت بھی زیادہ حاصل ہوئی کہ اُن کی تائید اور تعاون سے آلِ سعود نے نجد میں ایک مضبوط حکومت قائم کی جس کا حیطۂ اقتدار جزیرہ نمائے عرب میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ حجازِ مقدس بھی اُن کے زیرِ تسلط آ گیا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ کارِ تجدید کی وسعت اور گہرائی دونوں کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا پلڑا اُن کے مقابلے میں بہت بھاری ہے۔ اِس لیے کہ اگرچہ شیخ محمد ابن عبدالوہابؒ نے مشرکانہ اوہام کا ازالہ اور بدعات و رسومات کا قلع قمع تو خوب کیا اور دین کو اس کے ظاہری پہلوؤں کے اعتبار سے یقیناً جملہ آلائشوں سے پاک کر کے بالکل خالص کر دیا۔ لیکن چونکہ انہیں منطق اور فلسفے سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی لہٰذا دینِ حق کے حکمت و معرفت کے غامض اور عمیق پہلو خود اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے — اُن کے مقابلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رح نہایت جامع شخصیت کے حامل تھے چنانچہ تفسیر و حدیث اور اصولِ فقہ کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب، منطق و فلسفہ اور تصوّف و سلوک میں بھی درکِ کامل رکھتے تھے۔ اور راقم الحروف اپنے اِس احساس کے بیان میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ قرونِ اولیٰ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی اور شخصیت

نظر نہیں آتی ـــــ ان سب پر مستزاد یہ کہ شاہ صاحبؒ کو جدید عمرانیات کا موجدِ اوّل قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے ضمن میں انہوں نے علامہ ابنِ خلدون کے برعکس جنہوں نے سیاست اور حکومت کے معاملات و مسائل کو زیادہ پیشِ نظر رکھا تھا عہدِ حاضر کے تقاضوں کی مناسبت سے اصل توجہ 'فلسفۂ ارتفاقات' کے عنوان کے تحت معاشیات و اقتصادیات پر مرتکز کی ہے! ـــــ بہر حال کم از کم ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے نزدیک اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے مجدّد اور دورِ جدید کے 'فاتح' (افتتاح کرنے والے) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ (اور عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ ہندی نژاد بھی فاروقی النسب تھا!)

تیرہویں صدی ہجری میں صنم خانۂ ہند سے پھر ایک ایسی عظیم شخصیت اُبھری جس کی کوئی نظیر دورِ صحابہ رضؓ کے بعد نہیں ملتی۔ ہماری مراد ہے مجاہدِ کبیر اور شہیدِ عظیم سیّد احمد بریلوی رحؒ سے جنہوں نے سرزمینِ ہند میں پہلی بار خالص نبویؐ نہج پر تحریکِ جہاد برپا کی اور ایک بار دیکھنے والی نگاہوں کے سامنے دورِ صحابہ رضؓ کا عکس پیش کر دیا۔ کارِ تجدید کے منطقی تسلسل کے مظہر کے طور پر انہیں تمام تر تعاون اور سرپرستی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی سے حاصل ہوئی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحؒ کے دو فرزندانِ گرامی شاہ عبدالعزیز رحؒ اور شاہ عبدالقادر رحؒ نے اُن کی 'جانشینی' کی اور شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسماعیل رحؒ شہید نے اپنی تمام تر خاندانی وجاہت اور مسلّمہ علمی برتری کے باوجود اُن کے رفیقِ کار اور دستِ راست بننے کی سعادت حاصل کی اور آخر دم تک اُن کا ساتھ بلاشبہہ اسی شان سے دیا جس شان سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا۔

چودہویں صدی ہجری میں بھی واقعہ یہ ہے کہ جتنے عظیم اربابِ ہمت و عزیمت اور شہسوارانِ میدانِ تجدید و اصلاح برّصغیر پاک و ہند میں پیدا ہوئے اُن کی مثال پورا عالمِ اسلام نہ کمیّت (QUANTITY) کے اعتبار سے دے سکتا ہے نہ

کیفیت (QUALITY) کے اعتبار سے !

اِس صدی کے دوران، چونکہ عالمِ اسلام میں مغربی سامراج کے باعث تعلیم و تربیت کے دو مستقل دھارے جُدا جُدا بہہ نکلے تھے لہٰذا ان دونوں نے اپنا اپنا حق علیحدہ علیحدہ ادا کیا۔ چنانچہ دینی تعلیم و تربیت کے قدیم نظام سے فیض یاب ہونے والوں میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح ایسی عظیم اور جامع شخصیت بھی یہیں پیدا ہوئی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے جدید نظامِ تعلیم سے مستفید ہونے والوں میں سے علامہ اقبال مرحوم جیسا نابغۂ وقت اور رُومیٔ ثانی بھی اِسی خاک سے اُٹھا !

اِس پر مستزاد یہ کہ علماء کے حلقے سے ایک عظیم حرکت 'تبلیغ' کے عنوان سے اِسی خاکِ ہند سے ایسی اُٹھی جس نے اس وقت پورے عالمِ اسلام ہی نہیں، الحمدللہ کہ بہت سے دیارِ کفر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور دوسری جانب زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حلقے سے قوت پاکر اُبھری ایک دوسری عظیم تحریک ـــ تحریکِ جماعتِ اسلامی ـــ جس نے پورے عالمِ اسلام پر اثر ڈالا، یہاں تک کہ عالمِ عرب کی عظیم تحریک 'اخوان المسلمون' کو بھی فکری غذا فراہم کی اور اس وقت اِس تحریک کے زیرِ اثر متحرک اور فعّال لوگوں کی ایک کثیر تعداد پورے عالم ارضی میں پھیلی ہوئی ہے !

غور کا مقام ہے کہ کیا یہ سب کچھ محض اتفاقات کا کرشمہ ہے
یا اِس سے فطرت کی کوئی مشیّت اور قدرت کا کوئی ارادہ
ظاہر ہو رہا ہے ؟؟

کیا 'الفِ ثانی' کے مجدّدِ اوّل شیخ احمد سرہندی رح کا سرزمینِ ہند سے متعلق ہونا ایک بالکل اتفاقی امر ہے جن کے سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ کا جال نہ صرف پورے برِصغیر بلکہ افغانستان اور ترکی تک پھیلا ہُوا ہے اور جس کے زیرِ اثر خود رُوس کے زیرِ تسلط مسلم علاقوں میں ع " ہر قبا ہونے کو ہے اُس کے جنوں سے تار تار ! "

کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے؟ اِسی طرح کیا جُملہ علومِ اسلامی کے مجدّدِ اعظم اور تمدّنِ انسانی کے دَورِ جدید کے فاتح شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا ہندی نژاد ہونا بھی بالکل اتفاقی امر ہے؟ اور کیا اُن کی عظیم تصانیف کے ذریعے ہونے والی 'تجدیدِ علمِ اسلامی' کے وہ وسیع اور ہمہ گیر اثرات جو پورے برّصغیر کے طُول و عرض میں مختلف سلاسل اور مسالک سے منسلک علماء کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں رائیگاں جانے والے ہیں؟ اِسی طرح کیا تحریکِ شہیدین رح سے وابستہ سینکڑوں مجاہدوں کے مقدّس خون کا ارضِ پاکستان میں جذب ہونا بالکل بے نتیجہ رہے گا؟ پھر کیا جماعتِ شیخ الہند رح کی سوسالہ خدمات کوئی عظیم اور پائدار نتیجہ پیدا نہ کرسکیں گی؟ اِسی طرح کیا اُس حکیم الاُمّت، ترجمان القرآن اور مصوّرِ پاکستان کا سرزمینِ لاہور میں طویل قیام اور ابدی استراحت بالکل بے معنی ہے جس نے "کافرِ ہندی" اور "برہمن زادہ" ہونے کے باوجود 'فلسفۂ خودی' کے عنوان سے 'رُوحِ ایمان' کی بھی از سرِ نَو صحیح ترین تعبیر کی اور معاشرت و معیشت اور سیاست و ریاست کے ضمن میں اسلام کی ہدایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے مطابق صحیح ترین انداز میں پیش کیا؟ پھر کیا اُسی مردِ قلندر کا مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو جنوبی ہند سے شمالی ہند کو 'ہجرت' اور یہاں سے اپنی دعوت کے آغاز پر آمادہ کرنا کوئی لا اُبالیانہ معاملہ تھا؟

ہمارے نزدیک یہ تمام واقعات اور اُن کا حیرتناک تسلسل ایک خاص سمت میں اشارہ کررہا ہے اور وہ یہ کہ مشیّتِ ایزدی نے اسلام کے عالمی غلبے کے نقطۂ آغاز کے طور پر سرزمینِ پاکستان کو منتخب فرمالیا ہے! اور اگر ہمارا گمان صحیح ہے تو ع "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!!"

دعوتِ رجوع الی القرآن

یہ سب ... کے حوالے سے یہ بات ...

سامنے آچکی ہے کہ دینِ حق کی تجدید، اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور اُمّتِ مُسلمہ کے عالمی غلبے کی عملی جدّوجہد کا مرکز و محور قرآنِ حکیم ہے، اِس لیے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک فرمان کے مطابق قرآن ہی ایک جانب ذکرِ حکیم ہے تو دوسری جانب صراطِ مستقیم ہے اور تیسری جانب حبل اللہ المتین (اللہ کی مضبوط رسّی) ہے[1] اور آپؐ کے ایک دوسرے فرمان مبارک کی رُو سے یقیناً اللہ تعالےٰ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو عروج عطا فرمائے گا اور اسی کے سبب سے ذلیل و خوار کر دے گا۔[2]" چنانچہ اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے علّامہ اقبال مرحوم نے کہ ؎

" خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ "

اِس پس منظر میں غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ رجوع الی القرآن کی تحریک بھی جس شدّت و قوّت اور جس گہرائی و گیرائی اور جس وُسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ گذشتہ دو سو سال سے برِّصغیر پاک و ہند میں چل رہی ہے اُس کی بھی کوئی نظیر پورے عالمِ اسلام میں نہیں ملتی!

واضح رہے کہ یہ تحریک اٹھارہویں صدی عیسوی کے آواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں شاہ ولی اللہؒ کی الفوز الکبیر اور فارسی ترجمۂ قرآن اور اُن کے صاحبزادوں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدّینؒ کے اُردو تراجم سے شروع ہوئی تھی، انیسویں صدی کے اواخر میں سرسیّد احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی کی غلط اور گمراہ کُن تاویلات کے مخالفانہ ردِّ عمل (ANTI THESIS) سے ؎

" تُندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے! "

---

[1] .... وَهُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ ... (رواہ الترمذی و الدارمی عن علیؓ ابن ابی طالب)

[2] " اِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ (رواہ مسلم عن عمرؓ ابن الخطاب)

کے مصداق مزید جذبہ اور اضافی قوت حاصل کر کے بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ایک 'دھماکہ' کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور اس کے بعد اس نے ایک جانب مولانا اشرف علی تھانوی کی 'بیان القرآن'، اور حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور حواشی اور بعد ازاں دیوبندی بریلوی اور اہلحدیث مکاتب فکر کے بیسیوں علماء کے تراجم و تفاسیر کی صورت میں پیش قدمی کی تو دوسری جانب یہ علامہ اقبال مرحوم ایسے 'رومیٔ ثانی' کے کلام میں نہایت پُرشکوہ اور دلآویز انداز اور جدید تعبیرات کے لباس میں جلوہ گر ہوئی ـــــ اور ان دو انتہاؤں کے بین بین اس نے ایک جانب مولانا آزاد مرحوم کے معنوی جانشین مولانا مودودی مرحوم کی 'تفہیم القرآن' کی صورت میں ظہور کیا جس نے بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو غلبۂ اسلام کی عملی جدّوجہد کے لیے آمادۂ عمل (MOTIVATE) کیا تو دوسری طرف امام حمید الدین فراہی کے جانشین مولانا امین احسن اصلاحی کی 'تدبر قرآن' کی صورت میں بہت سے تشنگانِ علمِ قرآن کی آسودگی کا سامان فراہم کیا!

واضح رہے کہ یہاں برصغیر پاک و ہند میں گذشتہ ایک سو سال کے دوران پیدا ہونے والے تفسیری لٹریچر کی تفصیل نہ مطلوب ہے نہ ممکن، بلکہ وضاحت صرف اس امر کی درکار ہے کہ اس عرصہ میں دعوت الی القرآن اور تفسیر قرآن کا کام جس وسعت اور شدّت کے ساتھ یہاں ہوا ہے اور کہیں نہیں ہوا چنانچہ کم از کم اس دور کی حد تک وہ بات جو عام طور پر صرف ایک دلچسپ مقولے کی حیثیت سے بیان ہوتی ہے غلط نہیں ہے کہ "قرآن نازل مجاز میں ہوا لیکن اس کی قرأت کا حق ادا کیا اہل مصر نے، اور اس کی کتابت میں کمال دکھایا ترکوں نے اور اسے سمجھنے کا حق ادا کیا ہندیوں نے" ـــــ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کچھ اسی انداز میں فرمایا ہے کہ :

؎ "عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی!"

بہر حال، برِ صغیر کے طول و عرض میں رجوع الی القرآن کی اِس تحریک نے جو اثرات پیدا کیے، ہر شخص جانتا ہے کہ اب حالات نے اُن کو سمیٹ کر ارضِ پاکستان میں مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے ساتھ ذوق و شوق اور شغل و شغف کے علاوہ 'دعوتِ رجوع الی القرآن' کا جو ہمہمہ اور غلغلہ اِس وقت سرزمین پاکستان میں ہے وہ اور کہیں موجود نہیں ہے!

یہاں ایک بار پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ بھی محض اتفاق کا کرشمہ ہے؟ یا کیا قرآنِ حکیم ایسی ہی غیر مؤثر شے ہے کہ رجوع الی القرآن کی یہ عظیم مساعی بے نتیجہ اور لاحاصل رہیں؟؟؟!

اِن سوالات کا جو جواب ہر صاحبِ ایمان کے قلب کی گہرائیوں سے بے اختیار نکلے گا وہ یہ کہ ہرگز نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم ترین معجزہ تو عصائے موسےٰؑ سے کہیں اعلیٰ دافع اور زیادہ کارگر اور مؤثر ہے۔ چنانچہ جملہ باطل عقائد و خیالات اور گمراہ کن فلسفوں اور نظریوں کو یہ بالکل اُسی طرح ختم کر سکتا ہے جیسے عصاءِ موسےٰؑ نے ساحرانِ مصر کے سانپوں اور اژدہوں کو ہڑپ کر لیا تھا اور اُمّتِ مسلمہ کے لیے یہ ہر دَور اور ہر زمانے میں، مشکل ترین حالات اور ناموافق ترین کیفیات میں ویسے ہی راستہ بنا سکتا ہے جیسے عصاءِ موسےٰؑ نے سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کے لیے بنایا تھا! چنانچہ یہ ایک اضافی شہادت ہے اِس امر کی کہ ارضِ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بڑے منصوبے کی تکمیل کے لیے چُن لیا ہے!

تحریکِ آزادی میں مذہبی جذبے کی آمیزش

اُمّتِ مسلمہ کی اپنے دوسرے دَورِ زوال سے نکل کر اُس تیسرے اور آخری عروج کی جانب پیش قدمی کا پہلا مرحلہ، جو اِن شاء اللہ العزیز اسلام کے عالمی غلبے پر منتج ہوگی، آزادی کی اُن تحریکوں پر مشتمل ہے جو تقریباً تمام

مسلمان ممالک میں بیسویں صدی عیسوی کے ثلث اوّل کے بعد سے چلنی شروع ہوئیں اور صدی کے وسط کے لگ بھگ یکے بعد دیگرے کامیابی سے ہمکنار ہوتی چلی گئیں! تا آنکہ اب روئے ارضی پر مسلم اکثریت کے علاقوں میں سے صرف چند ہی ایسے رہ گئے ہیں جو اغیار کے براہِ راست عسکری تسلط میں ہوں (اگرچہ مغرب کی ذہنی و فکری، علمی و فنی، معاشی و اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی غلامی تا حال برقرار ہے!)

حصولِ آزادی کی ان تحریکوں کے بارے میں ایک بات تو یہ اظہر من الشمس ہے کہ اپنی بنیادی نوعیت کے اعتبار سے یہ نہ دینی و مذہبی تھیں نہ اصلاحی و تجدیدی بلکہ خالص قومی اور سیاسی تھیں اور ان سب کا تعلق اصلاً 'تیسری دنیا' کے ایک مشترک معاملے (THIRD WORLD PHENOMENON) سے ہے' جس کا مذہب سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے ـــــ تاہم ان کے ذریعے احیاءِ اسلام کی تمنا اور غلبۂ دین کی آرزو کو یقیناً تقویت حاصل ہوئی ہے اور ان کے ذریعے حاصل شدہ آزادی ان شاء اللہ العزیز اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا پیش خیمہ اور اسلام کے عالمی غلبے کا مقدمہ ثابت ہوگی۔

دوسری اور موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ ان تحریکوں میں کہیں بھی نہ اسلام کا نعرہ لگا نہ ہی مذہبی جذبے کو ابھارنے (یعنی INVOKE کرنے) کی کوئی کوشش ہوئی بلکہ اکثر و بیشتر یا تو صرف جذبۂ حُریت کو للکارا گیا یا کسی نسلی یا لسانی عصبیت کا سہارا لیا گیا، سوائے تحریکِ پاکستان کے کہ یہاں اصل نعرہ ہی یہ تھا کہ:

"پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!!"

یہی وجہ ہے کہ علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد نے اس میں بھرپور حصّہ لیا اور وقتی طور پر پورا مسلم انڈیا مذہبی جذبے سے سرشار ہوگیا۔ اور جیسا کہ ہم اس سے قبل تفصیل سے عرض کر چکے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' صادر ہوگیا۔

علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تاریخ ساز اور ولولہ انگیز انقلاب کے بارے میں کسی نظم میں یہ اشعار کہے ہیں : ؎

"یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے   کھیلنے جاتے تھے ایوانِ گہِ کسریٰ میں شکار

اور ؎ یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن   فاش کرنے لگے جبریلِ امیںؑ کے اسرار"

بالکل اسی طرح یہ بھی تحریکِ پاکستان میں اسی زوردار مذہبی جذبہ کی آمیزش کا کرشمہ تھا کہ بیسویں صدی کے عین وسط میں جبکہ پورے کرۂ ارضی پر الحاد اور مادہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اور دین و مذہب کی بنیادیں تک منہدم ہو چکی تھیں دس کروڑ سے زائد افراد کی ایک قوم نے دستوری اور قانونی سطح پر اپنی قومی و اجتماعی زبان یعنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ کلمۂ شہادت ادا کیا اور 'قراردادِ مقاصد' کے ذریعے حقِ حاکمیت کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے اپنے جملہ اختیارات کو اُسی ہی کی معین کردہ حدود کے اندر اندر استعمال کرنے کا عہد کیا! چنانچہ اِس سے جہاں ع" نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد!" کی کیفیت پیدا ہوئی وہاں (بادنیٰ تصرف) ع" کفر لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد!" کا نقشہ بھی سامنے آیا۔ چنانچہ اسی اسمبلی کے کچھ اراکین نے ؎ "رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں

کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!"

کے مصداق برملا کہا کہ "آج یہاں جو قرارداد پاس ہوئی ہے اِس کی وجہ سے ہم شرم کے مارے دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے!"

اور یہ بھی اِسی کا کرشمہ ہے کہ پاکستان میں آج تک جتنے دستوری مسودے مرتب ہوئے اُن سب میں بلا استثناء وہ دفعہ موجود رہی ہے جو سورۂ حجرات کی پہلی آیت کی دستورِ ملکی کی سطح پر بہترین اور صحیح ترین ترجمانی کرتی ہے اور اسلامی ریاست میں قانون سازی کی گنجائش (SCOPE) کی بھرپور تعیین کرتی ہے یعنی یہ کہ "یہاں کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکے گی!" یہ دوسری بات ہے کہ ہم آج تک اِس دفعہ کو پوری طرح نافذ العمل

(FULLY OPRATIVE) نہیں کر سکے ! لے

بہر حال ! ایک تیسری مرتبہ پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ کیا دِل مانتا ہے کہ یہ سب کچھ کارِ عبث اور دفترِ بے معنیٰ (EXERCISE IN FUTILITY) ہے ؟ اور کیا ہمارا حال اور مستقبل اتنے طویل ماضی سے بالکل منقطع ہو جائے گا ؟

جہاں تک ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا تعلق ہے، اُس کے نزدیک اس معاملے میں تاخیر اور تعویق تو ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہی نہیں عین متوقع ہے کہ اِس راہ میں ہماری طویل کوتاہیوں اور موجودہ خامیوں کے باعث کچھ نقصانات (SET BACKS) اور وقتی ناکامیوں (FAILURES) اور عارضی شکستوں (TEMPORARY REVERSALS) کا سامنا ہو، لیکن پاکستان کا اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بننا وہ تقدیرِ مُبرم ہے جو کسی طرح ٹالی نہیں جا سکتی ـــ اور یہی ہے ہمارے قومی و ملّی وجود کی تصویر کا واحد روشن رُخ جو کبھی، جب توجّہ اسی پر مرتکز ہو جاتی ہے تو میرے اُفقِ ذہن و قلب پر مہرِ درخشاں کے مانند چمکنے لگتا ہے اور کبھی، جب توجّہ زیادہ تر پاکستان کے موجود الوقت دینی، اخلاقی اور سیاسی حالات پر مرکوز ہو جاتی ہے تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی صرف ایک مختصر اور لرزتی ہوئی کِرن کا روپ دھار لیتا ہے ـــ چنانچہ اِسی اُمید و بیم کی کیفیت میں جو کچھ بن آتا ہے کیے جا رہا ہوں اور غالباً ایک حدیثِ نبوی علٰی صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام میں وارد شُدہ الفاظ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم

لے سورۃ الحجرات کی پہلی آیت اور اس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

"اے اہلِ ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اسکے رسول سے، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کئے رکھو (اِسلئے کہ) یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے !"

باب یازدہم

خلاصۂ مباحث

ایک فیصلہ کُن دوراہا

اِن سطور کی تحریر کے وقت قمری حساب سے پاکستان کی عمر کے چالیسویں سال کے مکمل ہونے میں چار ماہ سے بھی کم عرصہ باقی رہ گیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ داخلی اور خارجی، اور دینی اور دنیوی جملہ اعتبارات سے پاکستان اِس وقت ایک نہایت اہم اور فیصلہ کُن دوراہے پر کھڑا ہے۔

دینی اعتبار سے اِس دوراہے کی اہمیت اور نزاکت قرآنِ حکیم کے دو مقامات کی روشنی میں سمجھ میں آسکتی ہے:

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸ میں وارد شدہ حسبِ ذیل الفاظ کی روشنی میں کہ:

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا۔

(ترجمہ) "قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحمت نازل فرمائے، لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا (جو پہلے کرتے رہے ہو) تو پھر ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے۔ (جو پہلے کر چکے ہیں)"

اِس ضمن میں ایک عام کہاوت کہ "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" کے مطابق اور اُس اصول کے تحت جو ہم اِس سے قبل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ کبھی کبھی مشیتِ ایزدی کفار اور ملحدین کے ذریعے بھی پوری ہوتی ہے، رُوسی قائدین کے اُس قول کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو اُنہوں نے اب سے لگ بھگ پندرہ سال قبل سقوطِ ڈھاکہ کے حادثۂ فاجعہ کے بعد ہمارے اُس وقت کے سربراہِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے دورۂ روس کے موقع پر ماسکو میں منعقدہ ایک سرکاری استقبالیہ میں نہ صرف سفارتی آداب اور رکھ رکھاؤ بلکہ میزبانی کے عام دستور اور قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہی تھی کہ:

"ہم نے جو کچھ مشرقی پاکستان کے معاملے میں کیا، ہمیں اُس پر ہرگز کوئی پشیمانی یا ندامت نہیں ہے بلکہ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر برِصغیر میں دوبارہ اُسی قسم کے حالات پیدا ہوئے تو ہم پھر وہی کچھ کریں گے جو ہم نے اِس موقع پر کیا ہے!"

(۲) سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری آیت کے اِن الفاظ کی روشنی میں کہ:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ۔

(ترجمہ) "اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو اللہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور قوم کو قبول فرمائے گا!"

گویا مشیتِ ایزدی نے تو ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو اسلام کے عالمی غلبہ کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت حاصل کرنے کا بھرپور موقع عنایت فرما دیا ہے۔ اب یہ مسلمانانِ پاکستان کی سعادت یا شقاوت، اُن کے فکر و تخیل کی بلند پروازی یا پستی، اُن کی عالی حوصلگی یا کم ہمتی اور فی الجملہ اُن کی عزیمت یا سہل انگاری پر منحصر ہے کہ وہ "وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا" کی عملی تصویر بنتے ہیں یا "وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" کی مجسّم تصویر بن کر ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!" کا مصداق بن جاتے ہیں اور اسلام کے عالمی غلبے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو پسند فرما لیتا ہے![1]

عجیب اتفاق ہے کہ عین اُس وقت جب راقم کے قلم سے مندرجہ بالا مصرعہ تحریر میں آیا روزنامہ جنگ لاہور کا ۱۷ فروری ۸۶ء کا شمارہ آن پہنچا جس کی رُو سے برِّصغیر پاک و ہند کے باب الاسلام (یعنی سندھ) کے ایک اتنے معمّر سیاستدان نے کہ اُنہیں بقول خود اُن کے سابق وزیر اعظم بھٹو مرحوم کے ختنہ کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، کہا ہے کہ:

"میں مطمئن ہوں کہ پاکستان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا کیونکہ یہ نفرت کا گہوارہ بن چکا ہے!"

چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اس وقت ہم ایک نہایت فیصلہ کُن دوراہے کے عین سرے پر کھڑے ہیں۔ اور ہر صاحب بصیرت کو بچشم سر نظر آ رہا ہے کہ:

ایک جانب ہمارے قومی و ملّی وجود کا موجودہ دینی و مذہبی، دستوری و سیاسی اور اخلاقی و عملی 'منظر' اور اُس کا چالیس سالہ 'پس منظر' ہے جو بظاہر شیکسپیئر کے الفاظ "TO BE OR NOT TO BE ________ IS THE QUESTION" کے سوالیہ نشان کے ساتھ ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر چکا ہے نتیجۃً ملک و ملّت بالکل اُس کیفیت میں نظر آ رہے ہیں۔ جس کا نقشہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (ترجمہ) "تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر تھے" اور بظاہر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ 'خاکم

---

[1] قرآنی آیت کے حوالے کے لیے دیکھئے سورۂ اعراف آیت ۱۷۶

بدین، مکمل تباہی ہمارا مقدر بن چکی ہے!

دوسری جانب اُمّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا طویل پس منظر اور اس کا بالخصوص گزشتہ چار سو سال کا معاملہ ہے جس کے حوالے سے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک نہایت روشن اور تابناک رُخ سامنے آتا ہے اور باطن کے کانوں سے نہ صرف "اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت قریب ہے"[1] کا مژدہ سنائی دیتا ہے بلکہ "اللہ کی جانب سے مدد اور فتح قریب ہی ہے"[2] کی نوید جانفزا بھی سنائی دیتی ہے۔

تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ جبکہ متذکرہ بالا تاریک رُخ کے منفی نتائج اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکے ہیں جو ٹھوس واقعات کی صورت میں بالفعل موجود ہیں، روشن رخ کی حیثیت صرف ایک 'موقع' کی ہے جو اگر گنوا دیا گیا تو "اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ" (وقت ایک تیز دھار تلوار ہے) کے مطابق پھر کبھی ہاتھ نہ آسکے گا اور ملتِ اسلامیہ پاکستان "وَالْعَصْرِ ہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ہ یعنی "تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے اور خسارے میں ہے!" کی مجسّم تفسیر بن کر رہ جائے گی۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک!

اساسی عُقدہ اور اس کے منفی نتائج

جیسے کہ ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں، ہمارے قومی اور ملی وجود کا اساسی عقدہ (DILEMMA) تو یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی صورت میں ایک ایسا ملک قائم کیا ہے جس کی اساس واحد بلکہ واحد منطقی جواز صرف اور صرف 'اسلام' ہے، چنانچہ ایک عوامی اسلامی جذبے کے سوا اس کے استحکام کی کوئی دوسری ٹھوس اساس موجود نہیں ہے لیکن اسلام کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی ہمارے واقعی اور عملی تعلق کا حال حد درجہ مایوس کن بلکہ ع "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" کا مصداقِ کامل ہے! —— تاہم اس ایک جملے (STATEMENT) سے نہ صورتِ حال کی پوری نزاکت اور 'گھمبیرتا' کا احساس ہوتا ہے نہ ان منفی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا ہے جو اس اساسی عقدے کے منطقی نتائج کے طور پر ہمارے قومی و ملی وجود پر

---

[1] اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۵۶)

[2] نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ (سورۃ الصّف: آیت ۱۳)

دینی و مذہبی، اخلاقی و عملی، دستوری و ریاستی اور سیاسی و انتظامی ہر اعتبار سے مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے بعض پر اس سلسلۂ مضامین میں اس سے قبل تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، بعض کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ زیرِ بحث موضوع کے دائرے سے براہِ راست متعلق نہ تھے۔ ذیل میں اُن سب کا ایک مختصر خاکہ دیا جا رہا ہے:

(۱) ریاست کی سطح پر ہمارا حال یہ ہے کہ تا حال کوئی متفق علیہ دستور موجود نہیں ہے۔ آج سے ڈھائی سال قبل تک ملک کے اکثر سیاسی حلقے ۱۹۷۳ء کے دستور پر اتفاق کا اظہار کر رہے تھے لیکن اولاً مارشل لاء کی طوالت اور پھر ایک فردِ واحد کے آمرانہ اقدامات نے، جن کی ابتدا 'ریفرنڈم' نامی ڈھونگ سے ہوئی تھی، شدید ردِ عمل پیدا کر دیا ہے اور اب متعدد طاقتور اور مؤثر حلقے ایک نئی دستوریہ کے انتخاب اور نئے دستور کی تدوین کے مطالبے یا براہِ راست کنفیڈریشن کے نعرے کے ساتھ میدان میں اُتر چکے ہیں!

(۲) سیاسی سطح پر فوج کی مسلسل سرپرستانہ نگرانی نے قوم کو بحیثیتِ مجموعی تا حال 'نابالغ' بنا یا ہوا ہے چنانچہ عوامی سطح پر سیاسی شعور کا خوفناک حد تک فقدان ہے جس کے نتیجے میں ملک بھر میں کوئی ایک بھی ایسی قومی سیاسی جماعت موجود نہیں ہے جو ایک طرف خود منظم بھی ہو اور ملک گیر بھی، دوسری طرف قومی نقطۂ نظر بھی رکھتی ہو اور واضح نظریاتی اساس بھی، تیسری طرف ایک مضبوط اور باصلاحیت قیادت بھی رکھتی ہو اور مخلص اور بے نفس کارکنوں کی معتدبہ تعداد بھی، اور چوتھی جانب عوام میں قابلِ لحاظ حد تک پذیرائی بھی رکھتی ہو اور اثر و نفوذ بھی!!

(۳) معاشی سطح پر شدید افراطِ زر اور اس سے پیدا شدہ ہولناک گرانی کا سامنا ہے۔ اور ؎ "چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام۔ یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!" کے مصداق جو مصنوعی خوشحالی نظر آتی ہے وہ یا غیر ملکی قرضوں کے ہمالہ ایسے پہاڑ کی 'کرامت' ہے جو سیاسی اور معاشی اعتبار سے انتہائی تباہ کن ہے یا ملک سے باہر کام کرنے والوں کی خون پسینے کی کمائی کی فوری اور عارضی 'برکت' ہے جو مآلِ کار کے اعتبار سے اخلاقی اور سماجی سطح پر سخت مُضر اور نقصان دہ ہے! پھر وہ عارضی برکت بھی اب ختم ہوا چاہتی ہے جس سے فوری معاشی بحران کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے!!

(۴) قومی سطح پر ہمارا شیرازہ سخت پراگندگی کے عالم میں ہے اور مختلف النوع نسلی (ETHNIC) 'لسانی (LINGUISTIC) ——— اور علاقائی (REGIONAL) عصبیتوں کے فروغ نے قومی یکجہتی کو شدید ضُعف سے دوچار کر دیا ہے!

(۵) نظریاتی سطح پر قوم کے ذہین عناصر اور تعلیم یافتہ طبقات میں مغربی افکار و نظریات سے پیدا شدہ مادّہ پرستانہ اور مُلحدانہ اندازِ فکر اور جدید تہذیب و ثقافت کا پروردہ اباحیت پسندانہ نقطۂ نظر تو پہلے ہی سے موجود تھا، اب اُس کی منطقی انتہا یعنی مارکسزم اور کمیونزم نے بھی ہماری نوجوان نسل کے ایک خاصے بڑے حلقے میں قدم جما لیے ہیں!

(۶) اخلاقی سطح پر قوم کا دیوالہ نکلا ہوا ہے اور اخلاقیات کی اسلامی اور ایمانی سطح تو درکنار عام انسانی سطح پر بھی ہم اخلاق کے بحران (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے، دراصل ہم بحیثیتِ قوم اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی سزا اور پاداش کے طور پر 'نفاقِ عملی' میں مبتلا ہو چکے ہیں!

(۷) دینی سطح پر اسلام کے ساتھ عملی تعلق کے اعتبار سے ہم جس ع "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!" کی کیفیت سے دوچار ہو چکے ہیں اُس کی تفصیل تو پہلے آ چکی ہے، ایمان کے اعتبار سے بھی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔ اِس لیے کہ عوام کی سطح پر تو 'ایمان' بالعموم ایک عقیدہ (DOGMA) کی ایسی پوٹلی کے مشابہ ہے جو ذہن کے کسی ایک کونے میں رکھی ہوئی ہو اور جس سے انسان کے اخلاقی رویّے اور عملی اقدار (VALUE STRUCTURE) کا تعلق نہ ہو۔ اور خواص میں سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت یا باضابطہ الحاد (ATHEISM) کی شکار ہے یا کم از کم تشکک (SCEPTICISM) اور لاادریت (AGNOSTICISM) سے دوچار ہے اور علماء دین کے حلقے میں ایک کثیر تعداد اُن علماءِ سُوء کی موجود ہے جن کی عملی روش سے ہویدا حُبِّ دنیا، حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ اُن کے 'ایمان' کی ناگفتہ بہ حالت کی غمازی کر رہی ہے! مزید برآں اُن کی پیدا کردہ فرقہ واریت کی ہولناکی روز بروز بڑھ رہی ہے اور قومی سطح پر تشتت و انتشار (CHAOS) میں ایک مزید اور حد درجہ تشویشناک سمت (DIMENSION) کا اضافہ کر رہی ہے!

(۸) داخلی احوال و کوائف کی اِن تہہ بر تہہ تاریکیوں ("ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" سورۂ نور آیت نمبر ۴۰) پر مستزاد ہیں بین الاقوامی سیاست، خارجی تعلقات اور خاص طور پر اِرد گرد کے حالات اور اِس خطے کی علاقائی سیاست (GEO-POLITICS) کی شدید تشویشناک کیفیات جن کی بنا پر جو شدید خطرہ (CHALLENGE) پاکستان کے وجود کو اِس وقت لاحق ہے وہ اِس سے قبل کبھی

نہ ہوا تھا، اِس لیے کہ اصلاً اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث اور ثانیاً بھارت کی پیدائشی دشمنی کی بنا پر ہم ایک سُپر پاور کا سہارا لینے پر تو ہمیشہ ہی مجبور رہے ہیں۔ جس کے عین وقت پر دھوکہ دینے کا نہایت تلخ تجربہ ہمیں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء ہو چکا ہے، تاہم ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے کے بعد سے اُس نے ایک بار پھر ہمیں 'محاذ پر سینہ سپر ریاست' (FRON LINE STATE) ——— کی حیثیت سے اہمیت دینی شروع کر دی تھی اور اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ایک مرتبہ پھر امریکہ کے سابق سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ڈلس کے نام سے معنون دَور (DULLES ERA) ——— کی یاد تازہ کر دی تھی۔ لیکن اب وہ صورتِ حال تبدیل ہو رہی ہے اور ایک جانب افغانستان کے مسئلے پر امریکہ اور رُوس کے مابین مفاہمت کے اندیشے نے ہمارے پاؤں تلے کی زمین کو سرکانا اور کھسکانا شروع کر دیا ہے تو دوسری جانب راجیو گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے امریکہ نے بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کی جو سر توڑ کوشش شروع کی ہے اُس کی بنا پر ہمیں فی الواقع دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں اور بھارت کے سفارتی عہدیداروں اور سیکرٹریوں کے اندازِ تخاطب میں بھی "ایاز قدرِ خود بشناس!" کا سا انداز پیدا ہو چکا ہے۔

الغرض! "عین پیری میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی!" کے مصداق عین اُس وقت جبکہ خارجی حالات کے پیشِ نظر ہمیں کامل قومی یکجہتی و ہم آہنگی، بلند حوصلگی اور عالی ہمتی اور قوتِ عزیمت و مقاومت کی شدید ضرورت ہے ملک و ملّت کا داخلی منظر ع "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ مارشل لاء کے 'خاتمے' (یا 'نیم خاتمے') پر جو سیاسی سرگرمی شروع ہوتی ہے وہ ایک دو ماہ تک گھمسان کے رَن کی صُورت اختیار کر لے گی اور اِس کے نتیجے میں ملک یا باضابطہ خانہ جنگی اور بھول وار سے دوچار ہو جائے گا یا چوتھا مارشل لاء نافذ ہو جائے گا اور یہ دونوں ہی صورتیں ملک و قوم کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خوفناک اور حد درجہ تباہ کُن ہوں گی۔ اعاذنا اللہ من ذالک!

پاکستان کے بقا و استحکام کے لوازم

اِس پس منظر میں ہر صاحبِ فہم و شعور انسان لامحالہ اِسی نتیجے تک پہنچے گا کہ ملک و ملّت کے استحکام ہی نہیں بقا تک کے لیے حسبِ ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں:

(۱) ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جملہ حیوانی جبلتوں پر غالب آجائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لیے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے

(۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!

(۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد کی اساسات کو از سرِ نو مضبوط کر دے اور قومی و ملی زندگی کو رشوت، خیانت، ملاوٹ، جھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن برائیوں سے پاک کر دے۔

(۴) ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو مرد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف، اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!

(۵) ایک ایسی مخلص قیادت جس کے اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہ آتے اور جس کے خلوص و اخلاص پر عوام اعتماد کر سکیں!

تحریکِ پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے اور اسلام کے حوالے اور ناتے سے پورے کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ، جیسے کہ ہم ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد سے ثابت کر چکے ہیں علامہ اقبال مرحوم کے حسبِ دلیل اشعار خواہ اس وقت دنیا کی کسی دوسری مسلمان قوم پر پورے طور پر صادق نہ آتے ہوں، ملتِ اسلامیہ پاکستان کے ضمن میں صد فی صد درست اور کمالِ صداقت و حقانیت کے مظہر ہیں کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟ — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

پاکستان کی سالمیّت کے خواہشمند لوگوں کو

دعوتِ فکر

مرزا غالب کے اس شعر کے مصداق کہ ع "تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم - میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے!" ہمیں اِس مرحلے پر اُن لوگوں سے تو کچھ نہیں کہنا جو یا کسی حقیقی و واقعی یا مزعومہ و موہوم ظلم اور زیادتی کے ردِ عمل کے طور پر پاکستان کو توڑنے کے درپے ہو گئے ہوں یا کسی سبب سے اِس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ ع "مری تعمیر میں مضمر تھی اِک صورت خرابی کی" کے مصداق پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا ہی غلط تھا۔ لہٰذا اِسے بالفعل یا بالقوّہ معدوم کر دینا ہی مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کا صُغریٰ کُبریٰ ظاہر ہے کہ مختلف ہو گا۔ سرِدست اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم اُن تمام لوگوں کو جو پاکستان کی بقا اور سالمیّت کے دل سے خواہشمند ہوں دعوت دیتے ہیں کہ پوری دیانت داری کے ساتھ اِمکانی حد تک غور کریں کہ آیا متذکرہ بالا پانچ اُمور پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لوازم ہیں یا نہیں ہیں۔ اور آیا اُن میں سے کوئی ایک تقاضا بھی اسلام کے سوا کسی اور نظریے یا نظام کے حوالے سے پُورا ہونے کا کوئی امکان ہے؟؟

اِس ضمن میں حسبِ ذیل حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں:

(۱) تحریکِ پاکستان سے قطع نظر کہ اُس کا تو نعرہ ہی یہ تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا اِلٰہ اِلّا اللہ" پاکستان کی لگ بھگ چالیس سالہ تاریخ کے دَوران میں بھی واقعہ یہ ہے کہ جو بھی عوامی تحریک اُٹھی صرف اور صرف دین و مذہب کے حوالے سے اُٹھی! ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی ختمِ نبوت کی تحریکیں تو اِس کی 'خالص' مثالیں ہیں ہی، ۱۹۷۰-۷۱ء کی بھٹو صاحب کی عوامی تحریک کو بھی فی الواقع 'عوامی' بننے کے لیے سوشلزم کو 'مشرف بہ اسلام' کرنا پڑا تھا اور خالص مساوات کی بجائے "مساواتِ محمدیؐ" کی اصطلاح استعمال کرنی پڑی تھی، جس کا شکوہ اب اُن کے بعض سابق رفقاءِ کار کر رہے ہیں۔ پھر ۱۹۷۷ء کی 'پاکستان قومی اتحاد' (P.N.A) کی تحریک بھی جو ابتداءً خالص سیاسی اور جمہوری تھی 'عوامی' تب ہی بنی تھی جب اُس نے "تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ" کا عنوان اختیار کر لیا تھا۔

اِس ضمن میں اگرچہ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گزشتہ (یا حالیہ؟) مارشل لاء نے اپنے ساڑھے آٹھ سالہ دور میں اِس جذبے کو مضمحل کرنے اور اِس تلوار کو کُند کرنے یا عوامی زبان میں اِس غبارے کی ہوا نکالنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے لیکن اب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ پاکستان میں کوئی منفی اور "یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ[1]" کے مصداق تخریبی تحریک تو کسی دوسری اساس پر اُٹھ سکتی ہے لیکن پاکستان کی سالمیت کو بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کرنے والی مثبت تعمیری تحریک سوائے مذہبی جذبے کے اور کسی بنیاد پر نہیں اُٹھ سکتی!

(۲) یہی معاملہ 'نظریۂ جامعہ' کا ہے کہ پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کو ایک بنیانِ مرصوص بنانے کی صلاحیت رکھنے والا 'نظریہ' صرف اور صرف 'ایمان' ہے اِس لیے کہ ایک رشتۂ اخوتِ ایمانی ہی ہے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں سے بالاتر ہو کر پاکستان کے مسلمانوں کو ایک 'قوم' ہی نہیں ایک 'اُمّت' بلکہ ایک 'حزب' (پارٹی) بنا سکتا ہے اور پاکستان میں قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن سکتا ہے۔ یہ بات اِس سلسلۂ مضامین میں تفصیل کے ساتھ عرض کی جا چکی ہے کہ یہاں کوئی نسلی یا لسانی عصبیت ایسی موجود ہی نہیں ہے جو کُل پاکستان سطح پر بروئے کار آسکے۔

یہاں یہ وضاحت بھی نامناسب نہ ہوگی کہ الحمد للہ کہ پاکستانی قوم عمل کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی تہی دامن اور کوتاہ دست کیوں نہ ہو، اِسی طرح فقہ کی جزئیات میں اُن کے مابین خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو جہاں تک اساسی نظریے یعنی ایمان کا تعلق ہے اُس کے ضمن میں اختلاف بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور خصوصاً اُس کے منبع و سرچشمہ یعنی قرآن حکیم کے متن کے ضمن میں تو سرے سے کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ جس کا حوالہ اِسی باب میں پہلے بھی آچکا ہے، مسلمانوں کو جس "حبل اللہ" یعنی اللہ کی رسّی کو تھامنے کی تاکید کرتی ہے[2] اُس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیثِ مبارکہ میں صراحت فرمادی ہے کہ وہ قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اِسی حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

---

[1] سورۂ حشر آیت نمبر ۲۔ ترجمہ "اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھاتے ہوئے"۔

[2] "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا"

ترجمہ "سب مل جل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مبتلا مت ہو"۔

"از یک آئینی مسلماں زندہ است　　پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است!
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست　　اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست"[1]

(۳) اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں یہ حقیقت، بالکل قطعی اور حتمی ہے کہ اخلاقیات کے ضمن میں اُن کے یہاں علمِ وظائف الاعضاء (PHYSIOLOGY) کا "سب کچھ یا کچھ نہیں والا قانون" (ALL OR NONE ALAW) کارفرما ہے یعنی یہاں کسی قوم پرستانہ (NATIONALISTIC) یا مصلحت پرستانہ (UTILITARIAN) یا مسرت پسندانہ (HEDONISTIC) اساس پر بنیادی انسانی اخلاقیات کی تعمیر بھی بالفعل ممکن نہیں ہے اس لیے کہ یہاں اخلاق کی واحد ممکن اساس 'ایمان' ہے۔ وہ اگر بالفعل موجود ہو گا تو عام انسانی ہی نہیں اسلامی اور ایمانی اخلاقِ عالیہ بھی وجود میں آ جائیں گے بلکہ روحانیت کی بلندترین منزلیں بھی تعمیر ہو جائیں گی اور اگر وہ موجود نہیں ہو گا یا نہایت کمزور اور ضعیف ہو گا تو کسی دوسری اساس پر بنیادی انسانی اخلاق بھی وجود میں نہ آ سکیں گے!

(۴) یہ بات البتہ تفصیل طلب ہے کہ وہ واحد نظامِ زندگی جو ایک جانب افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے مناسب فضا فراہم کر سکتا ہو اور دوسری طرف فرد بمقابلہ معاشرہ و ریاست، مرد بمقابلہ عورت، اور سرمایہ بمقابلہ محنت ہر سطح پر اور جہت سے عدل و قسط پر مبنی ہو اور سب کے مابین حقوق و فرائض کے عادلانہ توازن کا ضامن بن سکتا ہو اللہ کے عطا کردہ 'دینِ حق' کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور اگرچہ اس دعویٰ کی حقانیت کے تفصیلی دلائل و شواہد اس تحریر کے دائرۂ بحث سے خارج ہیں تاہم موضوع زیرِ بحث کے اعتبار سے یہ حقیقت اہمیت کی حامل ہے کہ پاکستان کی مسلمان قوم کے طبقۂ متوسط میں، جو کسی قوم کی اصل ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بحمد اللہ بہت کثیر ہے جو دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کے ساتھ اس کے شدت کے ساتھ قائل ہیں اور یہ چیز کسی اسلامی انقلابی جد و جہد کے آغاز کے لیئے یقیناً ابتدائی سرمایہ (INITIAL CAPITAL) کی حیثیت رکھتی ہے!

---

[1] یعنی مسلمانوں کی حیاتِ ملی کا راز یہی ہے کہ وہ ایک آئین پر متفق ہیں، گویا پیکرِ ملت کے لیے رُوحِ حیات قرآنِ حکیم ہے۔ ہم تمام مسلمان تو دراصل پیکرِ خاکی کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں دھڑکنے والے دل کی حیثیت قرآن کی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! اُسے مضبوطی سے تھام لے، اس لیے کہ 'حبل اللہ' یعنی اللہ کی مضبوط رسّی وہی ہے۔ (اس ضمن میں قائدِ اعظم مرحوم کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ "ہمارا آئین، چودہ سو سال قبل طے ہو گیا تھا")۔

(۵) گویا ع "کافر نتوانی شُد ناچار مسلماں شو !" کے مصداق ہمارے قومی و ملّی وجُود کے جملہ عوارض و امراض کے ازالے اور معالجے، اور پاکستان کے بقا و استحکام کے لیے جو اُمور لازمی اور ناگزیر ہیں وہ سب کے سب ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہے ہیں اور وہ ہے 'اسلامی انقلاب' کی سمت۔! البتہ ایک قیادت کا مسئلہ ایسا ہے جو بظاہر ٹیڑھی کھیر بھی نظر آتا ہے اور بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کے مترادف بھی محسوس ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ اسلامی انقلاب کے لیے لامحالہ ایک ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو ایک جانب مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماءِ حق کا اعتماد حاصل کر سکے، دوسری جانب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی مطمئن کر سکے اور تیسری جانب عوام میں بھی مقبولیت حاصل کر سکے۔! اور فی الوقت بظاہر احوال جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ع "نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو۔ ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے!" کے مصداق شاید اُمتِ مسلمہ کی کوکھ ایسے سپوتوں کے اعتبار سے بانجھ ہو گئی ہے تاہم نویدِ قرآنی "اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا" (ترجمہ) "جان لو کہ اللہ زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔" (سورۃ حدید: آیت ۱۷) کی رُو سے اُمید رکھنی چاہیے کہ اُمّت کی سوکھی کوکھ بھی از سرِ نو ہری ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس ضمن میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ایسی قیادت نہ آسمان سے نازل ہو گی نہ ہی کہیں سے 'درآمد' کی جا سکتی ہے بلکہ اُس کے وجُود میں آنے کی واحد صورت یہی ہے کہ اللہ کے بھروسے پر ایک اسلامی انقلابی جد و جہد کا آغاز کر دیا جائے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو اسی جد و جہد کے دَوران وہ قیادت بھی اُبھر کر سامنے آ جائے گی اور اُسے عوام و خواص سب کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے گا!

کامیابی کی اصل ضمانت

اِس جد و جہد کی کامیابی کی اصل ضمانت وہ حقیقت ہے جو ہم "تصویر کا روشن رُخ" اور بالخصوص "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پاکستان" کے عنوان کے تحت عرض کر چکے ہیں یعنی یہ کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدّ و جہد ارادۂ خداوندی ہی کے ساتھ ہم آہنگی، تدبیرِ الٰہی کے ساتھ سازگاری اور بقول علّامہ اقبالؔ مرحوم "فطرت کے مقاصد کی نگہبانی" کے مترادف ہو گی۔ اِس صُورت میں مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کے مطابق اُس جد و جہد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید لازماً حاصل ہو گی اور وہ کیفیت پیدا ہو کر رہے گی کہ

ع " ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ " !:

"میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے قربِ حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔" (بخاریؒ عن ابی ہریرہؓ)

تاہم اِس جدوجہد میں اپنے آپ کو کھپانے کا عزم رکھنے والوں کو کامیابی کی اصل ضمانت صرف اپنے خلوص و اخلاص اور اِس جدوجہد میں اپنی استقامت کو سمجھنا چاہیئے اس لیے کہ اسلامی انقلابی جدوجہد وہ واحد جدوجہد ہے جس میں شریک افراد کے لیے ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ بالفرض اجتماعی سطح پر اُس تحریک کی کامیابی سردست اللہ کی حکمت میں نہ ہو تب بھی ۔۔ "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن ۔ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی !" کے مصداق اُن کا اصل مقصود تو شہادت علی الناس کے فریضے کی ادائیگی اور شہادت کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ !

اگلا سوال: ہماری اب تک کی کُل گزارشات کا لُبِّ لباب اور حاصل کلام صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:

"پاکستان کے اِستحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے!"

اور اسی پر ہم اِس کتاب کو ختم کر رہے ہیں۔

اِس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا ؟ اُس کے اَساسی لوازم کیا ہیں ؟ بنیادی طریق کار کیا ہے ؟ ابتدائی مراحل کیا ہیں ؟ اور تکمیلی اقدامات کیا ہونگے ؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اِن امُور کی بھی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے ؟ اور اِس کے نتیجے میں جو سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئیگا اُس کے اہم خدوخال کیا ہوں گے ؟

چنانچہ **'پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا اور کیسے ؟'** کے موضوع پر راقم الحروف اِن شاءَ اللہ جلد ہی اپنی دوسری تالیف کا آغاز کر دے گا۔ وما توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم !!

لاہور : ۱۷ر فروری ۸۶ء

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُورِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُونَ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

یعنی "وَیَکُونَ الدِّینُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ"

آیۂ اظہارِ دین

کے ضمن میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصریحات

(ماخوذ از 'ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء')

ترجمہ: مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

چونکہ دینِ حق کا غلبہ تمام دینوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حاصل نہیں ہوا کیونکہ نصاریٰ و مجوس اس وقت تک اپنے طمطراق پر قائم تھے۔ لہٰذا اکثر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں عاجز ہو گئے ہیں۔ ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگی۔ حسن بن فضل رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ غلبہ سے مراد حجت و برہان کا غلبہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے زیادہ مضبوط بات بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام دینوں پر غالب کر دیا (اس طرح) کہ جن لوگوں نے آپؐ کا کلام سنا ان پر واضح کر دیا کہ یہی حق ہے اور جس قدر دین اس کے خلاف ہیں باطل ہیں اور نیز آپؐ کو اس طرح غالب کر دیا کہ گروہ اہلِ شرک میں دو دین تھے۔ ایک دین اہلِ کتاب کا دوسرا دین اُمیوں[1] کا تو اُمیوں کو تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مغلوب کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور اہلِ کتاب (کی یہ حالت ہوئی کہ ان) میں سے بعض نے ذلت کے ساتھ جزیہ دینا منظور کیا اور آپؐ کا حکم ان پر جاری ہو گیا۔ یہی مطلب آپؐ کے دین کا تمام دینوں پر غالب آجانے کا ہے۔

---

[1] عرب کے لوگ زمانۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تین مذہب رکھتے تھے۔ بعض مشرک تھے بعض نصرانی بعض یہودی۔ نصرانی اور یہودی اہلِ کتاب کہے جاتے ہیں اور مشرکین امی بوجہ اس کے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ جب کسی آیت کے معنی میں کچھ مشکل پیش آجائے تو وہاں دو باتوں کی ضرورت ہے۔ اوّل یہ کہ ہم الفاظِ قرآنی کو لوگوں کے بیان کئے ہوئے معنے کے ساتھ عقل خالص کی ترازو میں (جو اوہام کی آفت سے محفوظ ہو) تولیں اگر دونوں میں موافقت ظاہر ہو تو فبہا ورنہ اس معنے کو ہم چھوڑ دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو ہم اپنا پیشوا بنالیں کیونکہ آپؐ قرآن کے (حقیقی اور اصلی) مفسّر ہیں۔ (اس قاعدہ کے موافق) جب ہم (لوگوں کے بیان کئے ہوئے معنے یعنی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کو جو (مقام) نجران کے نصرانیوں اور ہجر کے مجوسیوں اور خیبر کے یہودیوں پر آپؐ کو حاصل ہوا اور آپ نے ان سے جزیہ اور خراج لیا (عقل خالص کی ترازو کے) ایک پلّہ میں رکھتے ہیں اور (الفاظِ قرآنی یعنی) لیظھرہ علی الدین کلّہ کو دوسرے پلّہ میں رکھتے ہیں تو دونوں میں باہم میں کچھ مناسبت نہیں پاتے ایک تھوڑے سے ٹکڑے پر غالب آجانا تمام دینوں پر غلبہ نہیں ہو سکتا۔ تمام دینوں پر غلبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ تمام دینوں کی جڑ کھد جائے اور ان کے حمایتی درہم برہم ہو جائیں اور کوئی شخص ان دینوں کی طرف بلانے والے نہ رہے اور ان دینوں کی عزّت و بزرگی بالکل زائل ہو جائے (لہٰذا ہم نے ان تمام معانی کو چھوڑ دیا) باقی رہی حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (تو وہ حسب ذیل ہے[1])

"مسلم نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ دیا اور میں نے اس کی مشرق و مغرب سب دیکھ لیں اور بیشک میری امّت کی سلطنت اس حصّۂ زمین تک پہنچیگی جو میرے لئے لپیٹا گیا اور (فرمایا کہ) مجھے سُرخ و سفید دونوں قسم کے خزانے دیئے گئے[2]"

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ آپؐ فرماتے تھے روئے زمین پر کوئی گھر اور کوئی خیمہ باقی نہ رہے گا جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کرے کسی سعادت مند کو عزّت دے کر یا کسی بدنصیب کو ذلّت دے کر۔ عزّت دینے کی صورت یہ ہے کہ اللہ ان کو اہلِ اسلام میں سے کر دے اور ذلّت

[1] حضرت مصنّف رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر چھ احادیث نمونۃً درج فرمائی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان میں سے صرف دو احادیث نقل کر رہے ہیں (ادارہ)

[2] دونوں قسم سے مراد زر و سفید یعنی سونا و چاندی۔

دینے کی صورت یہ ہے کہ وہ اسلام کے محکوم بن جائیں۔ حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ اس وقت ہر جگہ دین اللہ کا ہوگا۔ ان احادیثِ صحیحہ کا مقتضا یہ ہے کہ پورا غلبہ دین کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوگا لہٰذا انہی احادیث کو ہم نے پیشوا بنایا اور آیتِ کریمہ کو آپ کے زمانۂ حیات سے متعلق نہ رکھا۔ الفاظِ قرآنی بھی اس کو نہیں چاہتے کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات ہی میں دینِ حق کو غلبۂ کامل ہو جائے چنانچہ اگر لیظھرہ کی ضمیر (منصوب متصل) ھدی اور دین حق کی طرف پھیریں تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کا ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجنا سبب ہو جائے گا اس ہدایت اور دینِ حق کے تمام دینوں پر غالب ہونے کا۔ اس صورت میں کچھ ضروری نہیں کہ وہ غلبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو جائے آپ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا گو تتمہ اس غلبہ کا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبوں کے ہاتھ پر ہوا اور اگر یہ ضمیر رسول کی طرف پھیری جائے تب بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ دین حق کا غلبہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبوں کے ہاتھ سے ہوا بلاشبہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا غالب ہونا ہے۔

اگر تم سن سکتے ہو تو ایک باریک نکتہ سنو!

خدا تعالیٰ جب کسی پیغمبر کو اصلاحِ عالم کے لئے اور بنی آدم کو نیکیوں سے نزدیک کرنے اور بدیوں سے دور کرنے کے لئے مبعوث فرماتا ہے اور غیب الغیب میں کوئی خاص صورت اس اصلاح کی مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اصلاح اسی صورت میں ظاہر ہو تو لامحالہ وہ صورت خاص اس پیغمبر کی بعثت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر جب حکمتِ الٰہی اس پیغمبر کو عالم ادنیٰ سے رفیقِ اعلیٰ کی طرف قبل اس صورت کی تکمیل کے لیجانا چاہتی ہے تو لامحالہ وہ پیغمبر ان مقاصد کے پورا کرنے کے لئے جو اس کی بعثت میں مندرج ہیں اپنی امت میں سے کسی شخص کو اپنا آلہ بناتا ہے اور اس کو تربیت کرتا ہے تاکہ اس کا دل الہامِ خداوندی کے نزول کے قابل ہو جائے اور پھر اس شخص کو ان مقاصد کی وصیت کر دیتا ہے اور ان کی ترغیب دیتا ہے اور ان مقاصد کے پورے ہونے کی دعا مانگتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص بدنی قوت نہ رکھتا ہو کہ حج کا ارادہ کر سکے مگر مالی طاقت رکھتا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ فریضۂ حج کے پورا کرنے کے لئے دوسرے سے حج کرائے اور اس کے نامۂ اعمال میں دوسرے کا حج لکھا جائے اور یہ شخص بوجہ سبب ہونے کے حکمِ الٰہی کا مطیع ہو اور ثواب حج کا پورا حصہ حاصل کرے۔ اس قسم کا خلیفہ بنانا ہر دین میں ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں

کو اپنا خلیفہ بنایا تھا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ بنانے کا ایک عجیب طریقہ تھا) انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک روٹی اپنے ہاتھ میں لی اور فرمایا کہ یہ عیسیٰ کا گوشت پوست ہے پھر وہ روٹی آپ نے حواریوں میں تقسیم کر دی۔ جب انہوں نے اس روٹی کو کھا لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مناجات کرنے لگے اور فرمایا کہ (یا اللہ) جس طرح انہوں نے یہ روٹی کھالی اور وہ ان کے بدن میں حلول کر گئی اسی طرح عیسیٰ ان کے بدن میں حلول کر جائے۔ اے خداوند! جو نظرِ رحمت تو میری طرف رکھتا ہے وہی ان پر مبذول فرما تاکہ یہ لوگ تیرے بندوں کو تیری طرف بلائیں۔
اسی قاعدہ کے موافق جب عالم میں جناب الوہیت کے متعلق بُرے اعتقاد پھیل گئے اور عقیدۂ ارجا کا رواج ہو گیا یعنی اعمال کو ساقط از درجۂ اعتبار[1] سمجھنا اور (برے) کاموں کے (بد) انجام سے خوف نہ کرنا جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کے خلاف ہے تو غضب الٰہی جوش میں آیا۔ اور ارادۂ انتقام (عالمِ) ملکوت میں پیدا ہوا۔ پھر ان لوگوں کے ہلاک و برباد کرنے کا ایک وقت مقرر ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ (ترجمہ[2]) ہر گروہ کے لئے ایک وقت ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک ساعت کے لئے بھی وہ گروہ نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے نہ آگے! چنانچہ وہ وقت آگیا تو حق تعالیٰ نے افضل افرادِ بشر یعنی ذاتِ مقدس ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی وحی آپؐ پر نازل فرمائی اور آنجنابؐ نے اپنی انتہائی کوشش کے ساتھ اس ہدایت اور دینِ حق کی طرف لوگوں کو بلایا۔ قابلیت رکھنے والے سعادت اندوز ہوئے اور بدبخت لوگ ملعون ابدی بن گئے۔ اسی بعثت کے ضمن میں وہ ارادۂ انتقام ان لوگوں میں سے جو جناب اُلوہیت کے متعلق بُرے اعتقادات رکھتے تھے قائم کیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم (باوجود سراپا رحمت ہونے کے) اس انتقام میں بمنزلۂ جارحہ (الٰہی) کے ہو گئے جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام (باوجود سراپا رحمت ہونے کے) صیحۂ[3] ثمود کے وقت

---

[1] مشرکین کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ جزا و سزا ہی کے قائل نہ تھے اعمال کا کیا اعتبار کرتے! رہ گئے یہود و نصاریٰ ان کا یہ خیال تھا کہ ہم بُرے اعمال کریں گے تب بھی جنت ہماری ہے کیونکہ ہم خدا کے دوست ہیں۔

[2] سورۂ الاعراف آیت ۳۴

[3] صیحہ بلند آواز کو کہتے ہیں قوم ثمود اسی آواز سے ہلاک کی گئی تھی۔ ثمود وہی قوم ہے جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے جب قوم نے اونٹنی کے پَیر کاٹے جو معجزہ سے پیدا ہوئی تھی تو یہ عذاب نازل ہوا۔

(جارحۂ الٰہی بنے تھے) اسی وجہ سے جو لڑائیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے واقع ہوئیں۔ وہ ان لڑائیوں میں شریک ہونے والوں کے لئے موجبِ نزولِ برکاتِ عظیمہ بنے اور ان لڑائیوں میں ایک ساعت کی شرکت صد سالہ عبادت کے برابر تہذیب باطن میں کارگر ہوئی اسی وجہ سے ہماری شریعت میں جہاد کا ثواب تمام عبادات کے ثواب سے بالاتر ہے اور اہلِ بدر و اہلِ احد و اہلِ حدیبیہ کی فضیلت مانی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ (اس آخری زمانہ میں) اصلاحِ عالم کی اور دشمنانِ خدا سے انتقام لینے کی ایک خاص صورت مقرر ہوگئی تھی اور وہ صورت یہ نہ تھی کہ وہ (مثل قومِ قارون کے) زمین میں دھنسا دیئے جائیں یا (مثل قوم ہود وغیرہ کے) ان پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں یا (مثل قومِ ثمود کے) صیحہ سے ہلاک کئے جائیں۔ اس خاص صورت کی تعیین کسی ایسی حکمت کے سبب سے ہوئی جس کو سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور وہ خاص صورت یہ تھی کہ (ادیانِ باطلہ) کے حامیوں اور دعوت دینے والوں کو بذریعہ قتل و گرفتاری و تاراج و بندش و خراج و جزیہ سرنگوں کرکے اور ان کی دولت و شوکت کو پائمال اور بے حقیقت کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے دین کو غلبہ دیا جائے اور یہ صورتِ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور آنجناب کی بعثت اس خاص صورت پر متضمن تھی۔ یہی مطلب اس آیت کا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ اس لئے بھیجا تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔

اور چونکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان روحانی نعمتوں کو جو بغیر رفیقِ اعلیٰ سے ملے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتیں پسند فرمایا اس لئے ضروری ہوا کہ دینِ حق کے غلبہ کو کامل کرنے اور دشمنانِ خدا کی سرنگونی کو پورا کرنے کے واسطے آپ کسی کو خلیفہ بنائیں تاکہ یہ سب باتیں آپ کے صحیفۂ اعمال میں درج ہو جائیں اور وہ ارادۂ انتقام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ضمن میں لپٹا ہوا تھا اپنا کام پورا کرے اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی خاص اور مقرب ملازم کسی بادشاہ کا (ترقی پاکر) محبت کی مجالس اور مقدس محافل میں بادشاہ کا ہم نشین ہو جائے اور بعض قلعوں کا فتح کرنا جن کے لئے بادشاہ نے بہت کچھ تاکید کی ہے۔ اپنے کسی اچھے کارگزار کے متعلق کر دے اور جب وہ قلعہ (اس کارگزار کے ہاتھ پر) فتح ہو جائیں تو اس ملازم کی عزت بڑھ جائے اور خلعتیں اور بخششیں اس کو ملیں جب یہ سب باتیں بیان ہو چکیں تو اب سمجھ

لینا چاہیئے کہ صحیح مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ جس قدر غلبہ دین حق کو حاصل ہوا وہ سب لیظہرہٗ میں داخل ہے اور اس غلبہ کے تمام اقسام میں اعلیٰ درجہ کی قسم یعنی دولت کسریٰ و قیصر کا درہم برہم کرنا بدرجۂ اولیٰ داخل ہوگا۔ اور اس قسم اعلیٰ کے حاصل کرنیوالے خلفا رضی اللہ عنہم تھے۔ انہی بزرگواروں کی کوششیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے سے (حق تعالیٰ کو) مقصود تھیں اور ان کی کوششیں آپ کی بعثت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں اور یہ بزرگوار تدبیرِ غیبی کے لئے اس کے ظہور کے آلات تھے لئے خلافتِ خاصہ کے یہی معنی ہیں لہ ::

لہ ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا تالیف فخر الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ مع ترجمہ کشف الغطاء عن السُنّۃ البیضاء از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی فاروقی مجددی قدس سرہٗ مطبوعہ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی از ص ۱۹۴ تا ص ۱۷۵ (تلخیص)

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

اس کے بعد مجھ سے کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی تو میں نے وہی باتیں جو اوپر درج کر آیا ہوں قدرے وضاحت سے بیان کر دیں ـــــــ

میرے بعد مرحوم مولانا محمد شفیع اوکاڑوی ثم کراچوی کے صاحبزادے مولانا کوکب نورانی نے تصوف کی اہمیت پر ایک مؤثر تقریر کی۔

آخر میں خواجہ صاحب نے دعا فرمائی اور اس پر مجلس ختم ہوگئی !

اس کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا ـــــ اور آخر میں خواجہ صاحب سے چند منٹ کی گفتگو علیحدگی میں ہوئی جس میں مَیں نے عرض کیا کہ میں تو آپ سے تفصیلی گفتگو کے لئے حاضر ہوا تھا لیکن آپ نے سارا وقت تکلفات اور تقریبات میں صرف کرا دیا ـــــ اب انشاء اللہ پھر کبھی موقع ہوا تو گفتگو ہوگی ۔

اس کے بعد ہم نے رخصت چاہی ـــــ اور خواجہ صاحب نے مع جمیع حاضرین ہمیں ازراہِ کرم بڑے دروازے تک آکر اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت فرمایا۔

اس کے سوا نہ وہاں کوئی محفل میلاد منعقد ہوئی ـــــ ! نہ میں یا میرا کوئی ساتھی 'داخلِ سلسلہ' ہوا ـــــ !!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بیش از بیش ہدایت اور استقامت عطا فرمائے ۔

شہد کا ہر قطرہ
صحت و توانائی کا سرچشمہ

لاتعداد شاداب پھولوں کے
جوہر سے شہد کا قطرہ قطرہ حاصل کرنا
نظامِ قدرت کا کمال ہے۔

ہمدرد خالص شہد انسان کے لیے
آبِ حیات ہے۔
یہ صحت قائم رکھتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے
اور توانائی میں اضافہ کرتا ہے۔

قدرت کا صحت و شفا بخش عطیہ

ہمدرد شہد
قدرتی گلوکوز

ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں

ٹیوب میں دستیاب ہے

نسرین
خوش اخلاقی کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے

HMD/HNY-1/85 ADARTS

حضرت شیخ الہند کی عظمت کے عناصرِ ترکیبی پر

ایک معروضی نظر!

گذشتہ دنوں جمعیۃ علماءِ ہند کے زیرِ اہتمام دہلی میں منعقدہ شیخ الہند سیمینار میں پیش ہونے والا ایک مقالہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

تاریخ عالم میں بہت سی ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنہیں بڑا کہا جاتا ہے۔ یہ شخصیتیں علم وعمل کے مختلف میدانوں میں اپنے خصائص وخدمات کی بنا پر بڑی کہلاتی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ پاک وہند کی تاریخ بھی بڑے بڑے علمائے دین، صوفیاءِ کرام، مشائخ عظام اور ادیبوں، مصنفوں، مدبروں، مفکروں اور قومی خدمت گزاروں کے ذکر سے خالی نہیں۔ ان کے نام ہماری زبان پر اور ان کے تراجم وتذکار زیرِ تحریر ومطالعہ آتے ہیں تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

یہ صورت تو اس وقت ہوتی ہے جب ہمارے ہاتھ میں ایک حقیقت پسند اور کُورخ کا قلم ہوتا ہے اور ہمارا ذہن تعصب سے اور زبان مبالغہ سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ مجرد ومنفرد عظمتوں کا یہی ذکر جب نیازمند زبان پر آتا ہے تو قلب عقیدت سے جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ اگر دردمندی پہلو میں ہو اور ارادت سے قلم کا سر جھک جائے تو ممدوح کے محاسن کی ایک ایک خوبی کو سو سو انداز سے بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ اس عہد کی ایک عظیم اور نادرِ روزگار شخصیت اور مذہب وسیاست میں سلطانِ وقت وسکندرِ اعظم تھے تو یہ ایک روادار قلم کی تحریر اور عقیدت مند قلب کا فیصلہ نہیں ہوتا، نہ یہ بات تحریر کرتے ہوئے ان کی کوئی مجرد خوبی ذہن میں آتی ہے۔ اگر کسی مجرد خوبی ہی کی بنا پر کوئی شخص عظمت کے تاج کا مستحق قرار پائے تو یقین کرنا چاہیئے کہ تاریخ ملتِ اسلامیہ پاک وہند میں ایسے بے شمار علماء کے نام ملتے ہیں جن کے علمی وتصنیفی کارنامے بے حد وحساب ہیں، ایسے صوفیاء ومشائخ ہیں جن

کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، شعلہ بیان و آتش نوا خطیبوں کی بھی تاریخ میں کمی نہیں فلسفہ و کلام کے ایسے ماہر ہیں جن کی نکتہ آفرینیوں کا کوئی جواب نہیں، ایسے حکماء عقلاء ہیں جن کی حکمت و دانائی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے، بے مثال شاعر، لاجواب ادیب اور ایسے صاحب طرز انشاء پرداز ہیں جن کے کلام و انشاء کی دل ربائیوں نے لاکھوں قارئین ادب کے الگ الگ حلقے اور مستقل مکاتب فکر و فن پیدا کر دیئے ہیں، کتنے ہی مدبّر اور مفکّر ہیں جن کے افکار نے زندگی کی تعمیر میں حصّہ لیا ہے مختلف علوم و فنون کی تاریخ میں ان کے نام عزت و احترام سے جگہ پانے کے مستحق ہیں، لیکن علم و فکر اور فلسفہ و عمل کے تمام اعتراف کے باوجود یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ "شیخ الہند" ان میں کوئی نہیں۔

اگر ہم انسانی عظمت کے بجائے علم و عمل کی کسی ایک خوبی اور فکر و سیرت کے کسی خاص حسن کے شیدائی ہوتے تو ہمارا مرجع اور مرکز عقیدت کوئی اور شخصیت بھی ہو سکتی تھی اور تعجب نہ ہوتا کہ ہم حضرت ہی کے حلقے کے کسی صاحب علم و فن کو اپنی نیازمندی کے اظہار کے لئے منتخب کر لیتے کہ اس حلقے میں بیشمار ادیب و خطیب، محدّث و مفسّر، شیخ و صوفی، مدرس و معلّم اور صحافی و مبلغ سے لے کر حکیم الامت تک موجود تھے۔ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں ان خصائص و محاسن کا منکر ہوں لیکن مجھے ایک جامع الصفات عظیم انسان کی تلاش ہے۔ کسی ایسی عمارت کی ضرورت نہیں جو اپنی تاریخ رکھتی ہو لیکن فیضانِ الٰہی کی بخششوں سے مالامال نہ ہو اور اپنے حسنِ تعمیر میں آگرے کے تاج اور نظارۂ جمال میں لاہور کے شالامار کی طرح کسی آمر کے حکم اور کسی سرمایہ دار کی دولت کی رہینِ منّت ہو۔ میں کسی ایسی عورت کے حسن کا متلاشی نہیں جسے قیمتی پتھروں کے استعمال سے رنگین و سنگین بنایا گیا ہو۔ میں ایک ایسی انسانی سیرت کا جویا ہوں جسے فکر و عمل کے حسن و توازن اور جامعیت نے عظیم بنایا ہو۔ جس کا تعلق اسی عہد سے ہو اور جس کا نام ہماری سماعت اور فہم کے لئے مانوس ہو جس کا فکر بلند، قلب فراخ اور نظر وسیع ہو جو اپنے مذہبی عقائد میں محکم اور سیرت اسلامی میں پختہ ہو، جو مسلمانوں کے لئے ایک آبرومندانہ زندگی کا خواہاں ہو۔ لیکن جس کی نظر میں تمام خلق انسانی خدا کا گھرانہ ہو اور وہ اس پورے گھرانے کی فلاح و بہبود کے لئے فکرمند ہو۔ جس کی ملّت پروری کا یہ عالم ہو کہ بلقان کی جنگ اور سمرنا و تھریس اور طرابلس کے میدانوں میں کسی مسلمان کے پیر میں کانٹا چبھے تو وہ دیوبند کی مسندِ رشد و ہدایت پر اور مجلس درس و تدریس میں تڑپ اٹھے لیکن اس کی انسانی ہمدردی و غم گساری کا یہ عالم ہو کہ اپنے غلام ملک میں ایک ایک برادر وطن کی آزادی کے لئے اپنی زندگی کی راحتوں کو قربان کر دے، جس نے میدانِ جنگ میں خدا اور اس کی بخشی ہوئی آزادی کے دشمنوں سے نفرت کرنا سیکھا ہو۔ لیکن جو مخلوق خدا سے محبت کرنے اور

انہیں ان کی چھینی ہوئی آزادی دلانے کے لئے پیدا ہوا ہو۔ مجھے ایک ایسے وجود گرامی کی تلاش ہے جس کا تعلق خواہ سہارنپور کے کسی قریے سے ہو، لیکن وہ پورے ملک کا افتخار ہو، اس کے نام کے ساتھ خواہ دیوبندی لکھا جاتا ہو لیکن اس کی سیرت تمام مکاتب فکر کے لئے محمود ہو، اس کا تعلق اگرچہ برصغیر پاک ہند سے ہو لیکن اس کا قلب پورے ایشیا میں استعمار کے استحصال پر خون کے آنسو روتا ہو اور اگرچہ وہ خود ایشیائی ہو لیکن اس کی نظر میں تمام روئے زمین پر بسنے والے انسان آزادی و امن میں برابر ہوں اور دنیا کا ہر مظلوم خواہ اس کا تعلق کسی ملک اور کسی قوم و طبقہ سے ہو، وہ یکساں ہمدردی و حمایت کا مستحق ہو۔

دنیا میں بہت سے خصائص و فضائل کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس میں طاقت و قوت، مال و دولت، حسن و جمال، حکومت و اقتدار بھی شامل ہیں۔ پس اگر کوئی شخص انہیں چیزوں کا پرستار ہے تو اسے کون روک سکتا ہے، وہ اپنے معبود کے حضور اپنی جبین عجز و نیاز جھکا دے۔ دنیا کی تاریخ عبودیت و نیاز کے حسین مناظر اور حیرت زا نظارہ ہائے جمال سے بھری پڑی ہے۔ آپ کے گرد و پیش کی دنیا میں نہ طاقت و قوت کے معبودانِ باطل کی کمی ہے جو انا ربکم الاعلیٰ کے نعرہ زن ہیں، نہ مال و دولت کے ایسے حسین مناظر کی جن کی دلفریبیوں نے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور نہ حکومت و اقتدار کے ایسے ساحروں کی جو درحقیقت خود مسحور ہیں لیکن ان کے اقتدار کی بجلیوں کی چمک اور حکم و صدائے انا و لاغیری کی کڑک نے عقلوں کو ماؤف اور ذہنوں کو مسحور کر رکھا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا میں مٹ جانے والی قوت و طاقت، متزلزل ہو جانے والے اقتدار اور فانی حسن و جمال کے آگے جھکے ہوئے سروں کی بھی کمی نہیں۔ خدا کی پھیلی ہوئی زمین پر کسی بھی ملک میں انسانی شرف کی پامالی کا یہ اندوہ ناک نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن آپ مجھے کسی ایسی شخصیت کا پتہ اور ایسی عظمت کا نشان بتائیں جو خصائص سیرت و فضائل علمی کی جامع ہو، جس کے افکار کی روشنی نے غلامی کی ذلت و نکبت سے آزادی کی عزت اور آبرومندانہ زندگی کی طرف رہنمائی کی ہو، جس کے پاس حکومت کا اقتدار نہ ہو لیکن وہ دلوں پر حکمران ہو۔ اس کے پاس مال و دولت نہ ہو لیکن اس کے سرمایۂ ذوق عمل سے ایک دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی ہو۔ وہ حسن و جمال ظاہری کا مالک نہ ہو لیکن وقت کے تمام سلاطین عشق اور شیفتگانِ حریت اس کی زلف کے اسیر ہوں اور اس کے ایک ادنیٰ اشارہ و ایما پر وطن میں اپنی زندگی کی راحتوں کو تج کر غربت اور جلاوطنی کی زندگی کی صعوبتوں کو اپنے لئے سرمایۂ راحتِ جاں سمجھ کر اپنے سینے سے لگائیں اور اس

کے عشق میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں کے لئے زنجیر کی کڑیاں ڈھالنے کا کام انجام دیں، وہ اپنی صلیب خود اپنے کندھے پر اٹھالیں اور آزاد زندگی کی سیر و گردش کی جگہ اسارت کے حبس اور زنداں کے سیہ خانہ وقید کو قبول کرلیں، جس نے زبان سے کبھی حکم نہ چلایا ہو لیکن دنیا نے اس کے نطق و بیان کے موتی چن لینے کے لئے اپنے دامن پھیلا دیئے ہوں، جس نے دنیا کو اپنی پرستش کے لئے نہ پکارا ہو کہ اس کے عقیدے میں یہ کفر تھا کہ انسانی شرف کو پامال کیا جائے لیکن دنیا نے عقیدت دنیا کا سر اس کے سامنے جھکا دیا ہو۔

حضرات! میرا ذوق ایک ایسی سیرت کے پاک باز حامل کے نظارۂ جمال ہی سے تسکین پا سکتا ہے جو اپنی زندگی کے تمام اعمال، روز و شب کے معمولات، اپنی شکل و صورت اور وضع قطع میں ایک مذہبی زندگی اور شخصیت کی مثال ہو لیکن وہ ملکی زندگی کے تقاضوں کو بھی سمجھتا ہو اور قومی فرائض کی بجاآوری میں وہ کسی قوم پرست سے پیچھے نہ ہو اور ایک مذہبی عالم ہونے کے ساتھ کہ وہی اسلامی زندگی میں رہنمائی کا سب سے زیادہ مستحق ہو سکتا ہے، وقت کی سیاست اور اس کی رفتار کار کا اندازہ شناس بھی ہو۔ مذہب و سیاست کے بام سنداں پر جس کی گرفت سخت ہو اور دونوں کو باہم آمیز کر کے ان کے دائرہ و حدود کی نزاکت پر نظر رکھ سکے اور شریعت کے خصائص کو عشق کے مطالبوں اور تقاضوں سے پامال نہ ہونے دے اور جس کی سیرت کی یہ خوبی ہو کہ سیاست کے دریا میں اپنی کشتی کی تختہ بندی کرلے اور دریا کے چھینٹوں سے اپنی زندگی کے دامن کو تر بھی نہ ہونے دے۔

حضرات! اس تمہید لطیف کو کہاں تک طویل اور اس حکایت لذید کو کب تک دراز کیا جائے میرے لئے اس حکایت میں خواہ کتنی ہی دل فریبی کا سروسامان ہو، لیکن یہ بات کسی طرح مناسب نہیں کہ آپ کی طلب کو اپنے ذوق بیان و داستان سرائی کا پابند کردوں۔ میں صاف الفاظ میں اپنے اس عقیدے کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ان تمام فضائل و محامد علم و عمل اور خصائص و محاسن فکر و سیرت اور ایثار وقت و جان اور جہاد ملی و قومی کی جامع کوئی شخصیت اگر ہے تو وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ہے۔

حضرت کی زندگی پر نظر ڈالنے اور آپ کے افکار و خدمات کے بیان و تجزیہ کے کئی انداز ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک انداز یہ ہوگا ——— اور عام طور پر اہل قلم اور اصحاب نظر اسی کو اختیار فرمائیں گے کہ علم و عمل کے مختلف میدانوں میں آپ کے افکار و خدمات کا جائزہ لیا جائے لیکن ان معنوں میں آپ کی ذات گرامی ایک ذات تھی کہاں! آپ کا وجود مقدس و گرامی مرتبت علم و ادب، فکر و نظر، مذہب

وسیاست، ایثار وعمل، اخلاق وسیرت اور مذہبی علوم فنون کے مختلف دبستانوں کا ایک دبستان اور سینکڑوں انجمنوں کی ایک انجمن تھا۔ آپ کے وجود مقدس سے فیضان الٰہی کے سینکڑوں چشمے پھوٹتے تھے۔ آپ کی ذات گرامی کا ایک خاص دور میں ایک محور ضرور رہا۔ لیکن اپنے دور میں آپ خود ایک نظام رشد وہدایت اور مذہب سیاست کے مرکز ومحور تھے۔ آپ کی خدمات کا جائزہ اس طرح بھی لیا جاسکتا ہے کہ آپ کی دعوت جو تعمیر نو سے لے کر انقلاب تک، مسند درس وتعلیم اور ذوق عمل کی تربیت سے لے کر میدان جہاد وعمل تک، تالیف وتدوین افکار سے لے کر جہاد لسانی کے ملی وقومی میدانوں تک، مسلمانوں کی عام اجتماعی زندگی سے لے کر بین الملی سطح تک اور مسلمانوں سے لے کر برادران وطن تک، ملکی حالات سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک اور اسلامی دینی دائرے سے لے کر قومی سیاست کے تمام گوشوں تک پھیلی ہوئی ہے اس پر بھی من حیث القوم نظر ڈالی جائے۔ دینی وملی، ملکی وقومی اور بین الاقوامی سیاست میں دارالعلوم کی مسند درس وتدریس، اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم وتربیت، جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف القرآن کا قیام ترکی کے لئے ایثار وقت ومال، مولانا عبیداللہ سندھی کا سفر کابل، خود حضرت کا سفر حجاز واسارت مالٹا، ریشمی رومال کی تحریک، خلافت کی تحریک اور ترک موالات، ہندو مسلم اتحاد، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علیگڑھ کا ربط واتصال، حضرت کی دعوت ورہنمائی کے خاص عنوانات ہیں۔

حضرات! فرصت کے ان چند لمحوں میں ان تمام دائروں میں حضرت علیہ الرحمہ کی رہنمائی اور سیرت وافکار کے خصائص کا ذکر اجمال سے بھی ممکن نہیں۔ اب اس صحبت کو ختم کرتا ہوں اور صرف اتنا عرض کروں گا کہ:

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے خانوادہ ولی اللہی میں شاہ اسمٰعیل شہید کو خود شاہ صاحب سے بھی اونچا مقام دیا فرمایا تھا اور یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر ان کے عہد میں شاہ صاحب بھی ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے ہوتے میں پوری علمی بصیرت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پورے علمی خانوادہ قاسمی میں جو برصغیر کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے، حضرت شیخ الہند کا وہی مقام ہے جو اس تحریک کے دور ثانی میں شاہ اسمٰعیل شہید کا تھا۔ حضرت شیخ الہند نے اپنی زندگی میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر اس دور میں حضرت قاسم العلوم نانوتوی علیہ الرحمہ ہوتے تو وہ بھی اسی سلطان وقت وسکندر عزم کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا یہ عہد سعادت اور دور علوم وافکار اسی ذات گرامی اور فضیلت مآب کا عہد ہے جسے تاریخ اسلامیان پاک وبھارت میں محمود حسن کے نام، دیوبندی کی نسبت اور شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرات! اس صحبت وفرصت کے لمحات اختتام کو پہنچے۔ رخصت چاہتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین: والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین
اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے پر ادارۂ 'تکبیر' کراچی کا محاکمہ اور ڈاکٹر صاحب کی وضاحت

ا۔ ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۸۶ء کے ادارتی نوٹ کا عکس

طریقۂ بیعت: ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودیؒ

بانیٔ جماعتِ اسلامی کا اصل موقف ان کے مکاتیب کی روشنی میں

تکبیر کے گزشتہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے بیعت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا مودودیؒ بھی نظامِ بیعت کے حامی تھے اور اس معاملہ میں ان کی فکر بالکل وہی تھی جو آج میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تشکیل جماعت سے ۱۰ ماہ قبل مولانا کی جانب سے حیدر آباد دکن کے محمد یونس صاحب کے نام مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھے جانے والے ایک خط کا حوالہ دیا تھا۔ اس خط کے مکمل متن کا جائزہ لیا گیا تو ریکارڈ پر تشکیل جماعت سے ٹھیک ۱۰ ماہ بعد ۲۸ جون ۱۹۴۲ء کو انہی محمد یونس صاحب کے نام مسئلہ بیعت ہی پر مولانا محترم کا ایک دوسرا خط بھی موجود پایا گیا جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شخصی بیعت کے داعی ہیں جبکہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ ہے کہ "بیعت کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو بلکہ اسلام کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص سے وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ جائے۔" ان کے نزدیک "اطاعت نظام کی ہونی چاہیے نہ کہ کسی شخص خاص کی۔"

ہمارے قارئین کی رہنمائی اور دلچسپی کے لئے مولانا مودودیؒ کے ان دونوں خطوط کا متن شائع کر رہے ہیں تاکہ وہ بیعت کے مسئلہ پر مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر کو پوری طرح باخبر ہو سکیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مولانا مودودیؒ کے موقف کا فرق ان پر واضح ہو جائے اور اس مسئلہ میں کسی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے

۲۔ مولانا مودودی مرحوم کے خطوط (غیر متعلق حصّے حذف کر دیئے گئے ہیں)

لاہور

مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاحاً بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہوتی ہو۔ جیسے بیعت رضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آیندہ مہم میں آپ کے ساتھ جان فروشی کریں گے۔

۲۔ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلّم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت تھی جو بالعموم اس شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبی کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبی کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبوی کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً کوئی دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ "من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت رائج رہی ہے، وہ دوسری قسم کی ہے اور وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرے اور احکام کو سمجھ کر ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرے بغیر اس کے کہ کسی روحانی مربّی کی بیعت اس کی گردن میں ہو، تو وہ نہ کوئی گناہ کرتا ہے نہ آخرت میں اس سے کوئی بازپرس اس امر کی ہوگی کہ اس نے کسی پیر کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا۔ البتہ اگر کوئی دیندار، متبعِ شریعت، صاحبِ اخلاقِ فاضلہ شخص اس کو مل جائے جس کی زندگی کو دیکھ کر اسے یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہ جانشینِ پیغمبرؐ ہونے کا شرف رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینا فائدہ سے خالی نہیں ہے بشرطیکہ بیعت کرنے والا خود بھی دین کا علم رکھتا ہو اور اپنے شیخ کا اندھا مقلد نہ ہو اور شیخ سے بشری کمزوری کی بناء پر اگر شریعت کے خلاف کچھ باتیں سرزد ہو جائیں تو مرید عقیدت مندی میں ان غلط باتوں میں بھی شیخ کی پیروی کرتا نہ چلا جائے۔ رہی موجودہ زمانہ کی پیری مریدی جس میں اصلاح و ارشاد کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا بلکہ بزرگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر ان کے نالائق، بےعلم، بداعمال جانشین اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بناتے ہیں اور لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈالتے ہیں کہ بس ہمارا ہاتھ پکڑ لینے کے بعد تمہارے لئے جنت واجب ہو جائے گی اور مریدوں سے اس طرح نذرانے وصول کرتے ہیں کہ گویا کہ وہ زمیندار ہیں اور اپنی اسامیوں سے لگان وصول کر رہے ہیں تو ایسی پیری مریدی کا واجب ہونا تو درکنار یہ جائز بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک معصیت

ہے۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا شمار کبائر میں ہے۔ میں ان پیروں کو بدترین مجرم اور ان کے مریدوں کو سخت گمراہ سمجھتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو میں بجبر اس گمراہی کو روک دیتا۔

اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک تعلق رکھتی ہیں۔ اعتقاد نام ہے اس رائے یا خیال کا جس پر آدمی پختگی کے ساتھ قائم ہو۔ اور اس رائے یا خیال کے مطابق کام کرنے کا نام عمل ہے۔ ان دونوں کو ایک نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ دونوں مل کر ایک زندگی بناتے ہیں اور صحیح اعتقاد اور عمل میں مطابقت کا نام ہی اسلامی زندگی ہے۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

لاہور

۲۸ جون ۴۲ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی غلط فہمی کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ایک چیز تو طریقہ بیعت و ارشاد کی روح ہے اور دوسری چیز وہ خالص ہیئت و شکل ہے جس میں یہ طریقہ صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہے۔ جہاں تک اس کی اصلی روح کا تعلق ہے وہ بالکل برحق صحیح اور پاک ہے مگر جہاں تک اس کی ہیئت و شکل کا تعلق ہے وہ گمراہ کرنے والے پیروں اور جاہل مریدوں کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے اس قدر انحطاط کی شکار ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے خراب لوازم اس قدر خلط ملط ہو گئے ہیں کہ اصل روح نہ صرف یہ کہ اس کے اندر باقی نہیں رہی بلکہ جہاں نیک نیت لوگ اس ہیئت و شکل میں کوئی صحیح خدمت بھی کرتے ہیں وہاں بھی بہت جلد ہی اس کے خراب لوازم عود کر آتے ہیں۔ اس بنا پر میری یہ رائے ہے کہ پیری مریدی کی وہ خاص شکل بدل دی جائے اور اس کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں سلسلۂ بیعت و ارشاد کی اصل روح تو موجود ہو مگر وہ خراب لوازم اور اختلافات نہ ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت نہ لی جائے۔ بلکہ صرف زبانی عہد لیا جائے۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے لیا کرتے تھے۔ ثانیاً سلسلہ کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو۔ بلکہ "اسلام" کی طرف منسوب ہو تاکہ شخصِ خاص کی وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔ ثالثاً تزکیۂ نفس اور اجرائے احکام اور اقامتِ نظم و انضباط وغیرہ کا کام جس شخص کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت میں ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص سردار نہ رہے اور دوسرا شخص اس کی جگہ آئے تو لوگوں کی اطاعت و وابستگی بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخصِ خاص کے گرویدہ رہیں جس کے امر پر ابتداء میں انہوں نے عہد کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں خلفائے راشدین کے دور کی تنظیم سے میں نے اخذ کی ہیں۔ ان کے مبارک دور میں اسلامی جماعت اسلام کی طرف منسوب تھی نہ کہ صدیق رضؓ یا فاروق رضؓ یا عثمان رضؓ یا علی رضی اللہ عنہم کی طرف۔ اسی طرح لوگوں کی وابستگی شخصِ صدیقؓ یا شخصِ فاروقؓ سے نہ تھی بلکہ امیر المومنین سے تھی جو بھی وقت کا امیر ہو۔ اور اطاعت نظام کی تھی نہ کہ شخصِ خاص کی۔

آپ نے جماعت اسلامی میں اپنے آپ کو تیسرے درجہ کی ممبری کے لیے پیش کیا ہے اللہ آپ کو درجہ دوم بلکہ درجہ اول تک ترقی کرنے کی توفیق بخشے ....

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

۳- امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی وضاحت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی مدیر تکبیر ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"تکبیر" کی اشاعت بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۱۹۸۶ء میں "بیعت" سے متعلق میرے انٹرویو میں وارد شدہ ایک رائے کا محاکمہ "مولانا مودودی مرحوم کے دو خطوط" کے حوالے سے کیا گیا ہے ——— اس ضمن میں یہ چند سطور پیش خدمت ہیں جن کی حیثیت ایک جانب "ذاتی وضاحت" کی ہے اور دوسری جانب ایک واقعاتی تحقیق کی۔ اُمید ہے آپ ان کی اشاعت کے لئے گنجائش نکال لیں گے۔

میرا تنظیم اسلامی کے لئے "بیعت" کے نظام کو اختیار کرنا ہرگز اس دلیل پر مبنی نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے علم میں مولانا کا موقف تو آج سے صرف تین چار سال قبل حیدرآباد دکن کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام مولانا مرحوم کے کتابی شکل میں شائع شدہ خطوط کے ذریعے آیا۔ جبکہ میرا یہ ذہن کہ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ "بیعت جہاد" اور "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کی اساس پر قائم ہونا چاہئے، جماعت سے علیحدہ ہونے کے دو سال بعد ہی اوائل ۱۹۵۹ء میں بن چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ میری ذاتی رائے تھی جسے میں اپنے بزرگوں پر کسی طرح مسلط نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا جب ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خان میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے بعض حضرات کا اجتماع ہوا اور اس میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہو گیا اور اس کے لئے تنظیمی ڈھانچہ طے کرنے کے لئے سات افراد پر مشتمل ایک مجلس مقرر کر دی گئی تو اگرچہ میں بھی ان سات میں کا "ساتواں" تھا لیکن مجھے ہرگز یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ اس تنظیم کی اساس بیعت پر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان سات افراد میں ہر اعتبار سے اوّلین اور اہم ترین شخصیت مولانا امین احسن اصلاحی کی تھی جن کے مزاج سے میں بخوبی واقف تھا۔ تاہم میں چونکہ دوسرے مروجہ طریق ہائے تنظیم کو بھی حرام نہیں بلکہ مباحات میں سے سمجھتا ہوں لہٰذا میں ذہناً اس کے لئے بالکل تیار تھا کہ نظام خواہ کوئی بھی ہو اگر اقامت دین کے لئے طریق کار درست ہو تو لازماً شریک رہوں گا۔ ——— یہ دوسری بات ہے کہ یہ بیل منڈھے تو کیا چڑھتی سرے سے اُگ ہی نہ سکی! ——— اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ کیا تو اس کے لئے قرارداد تاسیس بھی وہی رکھی جس پر ۱۹۶۷ء میں اتفاق ہوا تھا اور نظام جماعت کے معاملے کو بھی کھلا (OPEN) رکھا کہ تین سال تک میری حیثیت صرف داعی (CONVENER) کی ہوگی ——— اور اس عرصے کے دوران جو حضرات قرارداد تاسیس پر اتفاق کرتے ہوئے جمع ہو جائیں گے وہ باہمی مشورے سے مستقل نظام طے کریں گے! ——— لیکن جب اڑھائی سال انتظار کے بعد بھی بزرگوں میں سے کسی نے سرپرستی نہیں فرمائی تو بالآخر میں نے جولائی ۱۹۷۷ء میں ساتھیوں کے سامنے اپنا ذہن کھول کر رکھا۔ نتیجۃً "بیعت" ہی کو تنظیم کی مستقل اساس کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔

اس کے بعد جب ۱۹۸۲-۸۳ء میں "خطوط کے چراغ" نامی کتاب حیدرآباد دکن سے آئی اور اس سے معلوم ہوا کہ مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مولانا مودودی مرحوم نے بالکل وہی بات فرمائی تھی جس کا میں قائل ہوں تو اس پر فطری طور پر مجھے خوشی بھی ہوئی کہ ع "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!" اور اپنی بات پر مزید اطمینان بھی ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا موقف مولانا مرحوم کی رائے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے مطالعہ کے مطابق قرآن حکیم اور سنت و سیرت رسول ﷺ کی محکم اساسات اور اُمت کے طویل تعامل پر قائم ہے!

البتہ جہاں تک علمی اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم کے موقف کی تحقیق کا سوال ہے تو جو خطوط آپ نے شائع کئے ہیں اُن میں حسب ذیل اُمور پر معروضی طور پر توجہ کی ضرورت ہے:

(۱) مولانا مرحوم کا مارچ ۱۹۴۱ء والا خط نہایت واضح ہے ۔ــــــ اُس میں اُنہوں نے بیعت کی لیں تو تین لیکن حقیقتاً چار اقسام بیان کی ہیں ، ایک خاص مواقع پر خاص کاموں کے لئے کی جانے والی بیعت (۲) بیعتِ ارشاد و سلوک اور (۳) بیعتِ نظمِ جماعت ، اِس آخری بیعت کے ضمن میں دُوبار مولانا نے "امیر یا امام" کے الفاظ الزاماً استعمال کئے ہیں جن سے (جیسا کہ بعض دیگر شواہد سے ثابت ہوتا ہے جن کا ذکر بعد میں آئے گا) اِس کی دو قسمیں بنتی ہیں یعنی ایک یہ کہ اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اُس کے سربراہ سے بیعت اور دوسری اِس صورت میں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اُس کے لئے جدّوجہد کرنے والی جماعت کے امیر سے بیعت !

(۲) اِس کے بعد مولانا نے دوسری قسم کی بیعت یعنی بیعتِ ارشاد و سلوک کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے ــــــ اور پھر اِس میں دورِ حاضر میں جو خرابیاں در آئی ہیں اُن پر شدید تنقید بھی کی ہے ــــــ مجھے اِس وقت اِس سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہے کہ مولانا کی یہ آراء کس حد تک صحیح ہیں اور کس حد تک غلط ــــــ یا کس حد تک واقعیت پسندی پر مبنی ہیں اور کس حد تک اِنتہا پسندی کی مظہر ! ـــــ اِس لئے کہ میری ساری گفتگو مولانا کی بیان کردہ تیسری قسم کی بیعت سے ہے جسے میں نے مزید دو اقسام میں منقسم قرار دیا ہے۔

(۳) اب آئیے مولانا مرحوم کے ۲۸ جون ۱۹۴۲ء کے خط کی جانب تو اِس میں اوّلاً مولانا نے پیری مریدی والی بیعت پر دوبارہ اُسی انداز کی بھرپور تنقید کی ہے ــــــ اور ثانیاً اِس میں بعض اصلاحات تجویز کی ہیں لیکن اُن کے ضمن میں جو مثالیں دی ہیں وہ کُل کی کُل خلافتِ راشدہ سے متعلق ہیں ۔ گویا حکومت والی بیعت کا ذکر تو موجود ہے لیکن جماعت والی بیعت کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا ــــــ ثالثاً ۔ خلفائے راشدین کی بیعت کے ضمن میں بھی اِس حقیقت اور واقعے سے صرفِ نظر کرنا مناسب سمجھا ہے کہ وہاں ہر بار نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی اور سابق خلیفہ کی بیعت از خود نئے خلیفہ کو منتقل نہیں ہو جاتی تھی ۔ رابعاً ــــــ اِس ضمن میں ہاتھ میں ہاتھ نہ لینے کے سلسلے میں خواتین کی بیعت کا ذکر کیا ہے لیکن مصافحہ کی حد تک جانے بغیر دونوں طرف سے ہاتھ بڑھانے ــــــ یا ایک برتن میں پانی ڈال کر اُس میں ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دستِ مبارک کو ڈالنا اور دوسری طرف جانب بیعت کرنے والی خاتون یا خواتین کے ہاتھ ڈالنے کا تذکرہ تک نہیں کیا ــــــ (حالانکہ تفہیم القرآن جلد پنجم میں سورۂ ممتحنہ کے ذیل میں یہ ساری باتیں بیان ہوئی ہیں !)

(۴) اِن دونوں خطوط کے مابین جو فرق و تفاوت ہے اُس کی حقیقت تک رسائی کے لئے اِس واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اِس عرصے کے دوران میں جماعتِ اِسلامی بالفعل قائم ہو چکی تھی اور مولانا مودودی اُس کے امیر قرار پا چکے تھے۔ ــــــ لیکن اُس کی رُوداد یا دستور میں 'بیعت' کی کسی قسم کا ذکر ــــــ یا اُس کی کسی اصلاح یافتہ شکل کا حوالہ تو درکنار سرے سے 'بیعت' کا لفظ ہی کہیں استعمال نہیں ہوا ــــــ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا ؟ ــــــ راقم کا موقف یہ ہے کہ ایسا اِس لئے ہوا کہ کسی سبب سے مولانا قیامِ جماعت کے وقت نظمِ جماعت کے ضمن میں اپنے اصل ذہن اور فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے! ــــــ چنانچہ اُن کی یہی ذہنی الجھن اِس خلافِ توقع کا باعث بنی ہے جو جون ۴۲ء والے خط میں نظر آتا ہے!

(۵) رہا یہ سوال کہ وہ سبب کیا تھا جس کے باعث مولانا مرحوم اپنے اصل ذہن و فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے تو اِس کا جواب اِس حقیقت کے حوالے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مولانا چاہتے تھے اِس کے قائل رہے کہ جماعتِ اسلامی کے امیر کو ویٹو کا اختیار حاصل رہنا چاہئے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء کے اجتماعِ الٰہ آباد کے موقع پر اِس مسئلے پر شدید بحث ہوئی اور اِس مسئلے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی مخالفت کے باعث اِس درجہ تلخی پیدا ہو گئی کہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ یہ اکٹھ قائم نہیں رہے گا اور جماعت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ بعض حضرات پر (بشمول مولانا مسعود عالم ندوی؟) گریہ بھی طاری ہو گیا تھا ــــــ بہرحال اُس وقت مولانا نے عافیت اِسی میں سمجھی کہ جماعت کے ٹوٹنے کے خطرے کو ٹال دیا جائے اور کوئی صورتِ مصالحت کی نکال لی جائے ۔ اِسی لئے کہ مولانا نعمانی اور مولانا علی میاں سمیت بہت سے علماء تو جماعت سے پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے اب مولانا اصلاحی اور بعض دیگر

کی علیحدگی سے جماعت کی دینی حیثیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا — چنانچہ ایک نہایت پیچ در پیچ فارمولا وضع کیا گیا۔ جس کی حیثیت خالص نظری ہی۔ اِس طرح وہ بحران تو ٹل گیا لیکن چونکہ اِس طرح اِن کا ذہن اور مزاج تو نہیں بدل سکا لہٰذا مولانا کا طرزِ عمل مسلسل یہ رہا کہ وہ جب بھی کوئی نیا قدم اُٹھانا چاہتے تھے اپنی صوابدید کے مطابق اُس کا آغاز کسی جلسۂ عام سے کر دیتے تھے اور بعد میں مجلسِ شوریٰ اِس شکنجے میں گرفتار ہو کر رہ جاتی تھی کہ اب امیرِ جماعت کے اقدام سے براءت کیسے کرے! — تاآنکہ ۵۶-۱۹۵۵ء کا بحران آیا اور اُس موقع پر مولانا نے ماچھی گوٹھ میں منعقدہ اجتماعِ ارکان میں فرمایا کہ میری راہ کی بعض مشکلات ایسی ہیں جن کی بنا پر میں امارت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ اگر انہیں دور کر دیا جائے تو البتہ میں یہ ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں۔ اور وہ وجوہات ایسی ہیں کہ میں انہیں تمام ارکان کے سامنے نہیں رکھنا چاہتا لہٰذا ہر حلقے سے دو دو افراد کا انتخاب عمل میں لایا جائے تاکہ میں ان کے سامنے اپنی مشکل بیان کر سکوں — اُس اجتماعِ نمائندگان کے سامنے مولانا نے اُس دستوری پیچیدگی کو بیان کیا اور دستورِ جماعت میں ترامیم کرا لیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی اُن منتخب حضرات میں شامل نہیں تھے البتہ مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے تھے چنانچہ اُن کے سامنے یہ معاملہ پہلی بار کوٹ شیر سنگھ میں منعقدہ اجتماعِ مجلسِ شوریٰ میں آیا۔ چنانچہ وہ اُسی وقت اُٹھ کر روانہ ہو گئے اور لاہور پہنچ کر انہوں نے جماعت کی رکنیت سے استعفاء دے دیا — اور بعد میں جو طویل خط و کتابت مولانا مرحوم اور مولانا اصلاحی کے مابین ہوئی اُس میں انہوں نے یہ الفاظ بھی لکھے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں بلّی کو مار چکا ہوں مجھے کیا معلوم تھا کہ اُسے آپ نے تھیلے میں چھپا لیا تھا — اور اب آپ نے 'خلوتیانِ راز' کے سامنے اُسے تھیلے سے نکال باہر کیا ہے! — کوٹ شیر سنگھ کے اجتماع میں مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر کی تھی اُس کا لبِ لباب یہ تھا کہ جمہوریت یا شورائیت کے تقاضے حکومت اور ریاست کی سطح پر کچھ اور ہوتے ہیں اور تحریک اور جماعت کی سطح پر کچھ اور! مولانا کے ۱۹۵۶ء کے ان الفاظ کا تعلق مارچ ۱۹۴۱ء کے خطاب میں مستعمل الفاظ "امیر یا امام" سے جڑتا ہے — اور یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے — کہ مولانا کا ذہن اصلاً یہ تھا کہ جماعتِ اسلامی کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہئے — اور اس کے ساتھیوں کو اُس سے 'سمع و طاعت فی المعروف' کے تعلق میں منسلک ہونا چاہئے — اور مشورہ و مشاورت کو اصلاً ساتھیوں کا 'حق' نہیں بلکہ امیر کی ضرورت اور ساتھیوں کا 'فرض' قرار دیا جانا چاہئے — البتہ معروف کے دائرے کے اندر اندر کسی بھی مشورے کو قبول یا رد کر دینے کا اختیار 'امیر' کے پاس ہونا چاہئے —

میں اِس موقف کو نہ صرف کتاب و سنت کے نصوص اور اُمّت کے مسلسل تعامل بلکہ اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کے تنظیمی تقاضوں کی مصلحتوں کے اعتبار سے بھی صد فی صد درست سمجھتا ہوں — اور اس کا اعلان بھی میں نے تحریری صورت میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر جولائی ۱۹۷۲ء میں کر دیا تھا — دس سال بعد ۸۲ء میں جب مولانا کا مارچ ۱۹۴۱ء والا خطاب پڑھنے میں آیا تو اُس سے راقم کو یقین ہو گیا کہ مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا جسے وہ اپنے بعض بااثر ساتھیوں کی مخالفت کی بنا پر پورے طور پر بروئے کار نہ لا سکے۔ بہرحال کسی کو اِس اندازِ فکر سے اتفاق ہو یا اختلاف — ہمارا اخلاقی فرض یہ ہے کہ حقائق و واقعات کو اُن کے اصل تناظر میں رکھ کر اُن کا حتی الامکان معروضی مطالعہ کریں — اور کسی کو بھلا لگے یا بُرا، جو حقائق بھی سامنے آئیں اُن کے علی الاعلان اظہار سے دریغ نہ کریں —

لاہور: ۱۰ مارچ ۸۶ء — فقط والسلام، خاکسار — اسرار احمد عفی عنہ

●●●●●●●●●●●●

یہ تحریر 'تکبیر' کو برائے اشاعت ارسال کی گئی تھی۔ اِس کا تازہ پرچہ اگرچہ ابھی ہم تک نہیں پہنچا لیکن بذریعہ فون معلوم ہوا ہے کہ اسے اُس میں قطع و برید کے ساتھ جزوی طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس پر ہمیں ادارہ 'تکبیر' سے گلہ بھی ہے اور احتجاج بھی اِس لیے کہ یہ صناعت کسی اور مضمون نگار کی رائے کے ضمن میں نہ تھی بلکہ خود ادارہ 'تکبیر' کی ادارتی توضیح کے ضمن میں تھی!

مدحِ عمرؓ بزبانِ صدّیق اکبرؓ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب! زید معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میثاق فروری ۸۶ء کے شمارہ میں افکار و آراء کے ذیل میں عزیزی شمس مجددی صاحب کے مکتوب سے خوشی ہوئی کہ انہوں نے آپ کے خطاب میں بالواسطہ اس عاجز کو بھی اپنے ایک مقالہ میں "لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہا اولہا" کو حضور علیہ السّلام کی طرف منسوب کرنے پر متنبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں اس سہو کو معاف فرمائے۔ یہ عاجز جب ماہنامہ "فیض" کے "عشاقِ رسولؐ نمبر" کے سلسلہ میں سرخیلِ محبّین حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات کے تفحص کے لئے متعلقہ کتب کی طرف متوجہ ہوا تو یہ کلمات آپ کے ایام مرض موت کے آخری خطبہ میں ملے جو آپ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے (پر) بعض صحابہ کی طرف سے ان کی شدّتِ طبع پر تشویش کے اظہار کے جواب میں دیا تھا، جیسے "کنز العمال" ص ۱۴۷ ج ۳ اور اسی طرح "کنز العمال" کے حوالہ سے "حیات الصحابہ" عربی ص ۲۴، ۲۵، ج ۲ (ہمارے پاس "حیات الصحابہ" کا جو ایڈیشن موجود ہے، وہ دہلی کا مطبوعہ ہے۔ اس میں یہ خطبہ ص ۲۷، ۲۸ ج ۲ پر ہے —) میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی (امیرِ تبلیغی جماعت، رحمۃ اللہ تعالیٰ) نے بھی "من یحتمل الخلافۃ" کے عنوان سے ذکر فرمایا، جو یہ ہے!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، احْذَرُوا الدُّنْيَا وَلَا تَثِقُوا بِهَا، (فَإِنَّهَا) غَرَّارَةٌ وَآثِرُوا الْآخِرَةَ عَلَى الدُّنْيَا فَأَحِبُّوهَا فَبِحُبِّ كُلٍّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا تُبْغَضُ الْأُخْرَى، وَإِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ الَّذِي هُوَ أَمْلَكُ بِنَا لَا يَصْلُحُ آخِرُهُ إِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهِ أَوَّلُهُ فَلَا يَحْمِلُهُ إِلَّا أَفْضَلُكُمْ مَقْدِرَةً وَأَمْلَكُكُمْ لِنَفْسِهِ أَشَدُّكُمْ فِي حَالِ الشِّدَّةِ وَأَسْلَسُكُمْ فِي حَالِ الشِّدَّةِ وَأَعْلَمُكُمْ بِرَأْيِ ذَوِي الرَّأْيِ، لَا يَتَشَاغَلُ بِمَا لَا يَعْنِيهِ وَلَا يَحْزَنُ بِمَا لَا يَنْزِلُ بِهِ وَلَا يَسْتَحِي مِنَ التَّعَلُّمِ

وَلَا يَتَحَيَّرُ عِنْدَ الْبَدِيْهَةِ، قَوِيٌّ عَلَى الْأَحْوَالِ، وَلَا يَخُوْنُ بِشَيْءٍ مِّنْهَا حِدَّةً لِعُدْوَانٍ وَلَا يَقْصُرُ وَيَرْصُدُ بِمَا هُوَ آتٍ عَتَادُهُ مِنَ الْحَذَرِ وَالطَّاعَةِ وَهُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ

"اے لوگو! دنیا سے ڈرو اور اس پر بھروسہ مت کرو، یہ دھوکہ باز ہے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اُسے پسند کرو کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی محبت دوسری سے نفرت کا باعث ہوتی ہے، یہ معاملہ جو اس وقت ہمارے لئے انتہائی اہم ہے۔ اس کا آخر اس چیز سے اصلاح پذیر ہو سکتا ہے جس سے اس کے اوّل نے اصلاح پائی اور اس کی برداشت اور اس ذمہ داری کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو تم میں طاقت ومقدرت کے لحاظ سے بہتر ہو، جو ضبط نفس کے لحاظ سے پختہ تر ہو اور کسی بھی سختی کے وقت تاثر نہ لینے میں وہ سخت ہو یعنی اعصابی لحاظ سے مضبوط ہو اور نرمی کے زمانہ میں وہ خوش مزاج ہو، مردم شناس ہو، اپنے ارد گرد خوشامدی ٹولے سے زیادہ عقل مندوں کو ترجیح دیتا ہو جس کے اوقات تعمیری ہوں اور جو اندیشہ ہائے فردا سے غم حال کی تعمیر میں منہمک ہو، اور جو کسی سے حصول علم میں حیا نہ محسوس کرتا ہو۔ جو اچانک حادثات میں ڈانوا ڈول نہ ہوتا ہو جو معاشی استحکام کا ذہن رکھتا ہو۔ اپنے غصہ کی سرکشی وظلم میں قومی دولت کی خیانت وتقصیر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ اس کے ذہن میں سفر آخرت کی تیاری کے سامان کا خیال رہتا ہو ــــ جو اللہ کا ڈر اور اس کی اطاعت ہے ــــ ان صفات کا حامل عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے"

یہ عاجز مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ اپنی اس غلط نسبت کے تدارک میں کچھ لکھے اور احباب سے اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرے۔

میری خوش قسمتی ہوئی کہ مجھے بھی موقعہ مل گیا کہ میں اپنی غلطی کی تلافی کر سکوں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک کہ عزیز کے مکتوب کے سلسلہ میں جناب نے جو ذاتی وضاحت فرمائی، آج کے اس ماحول میں بقول حضرت مجدد علیہ الرحمۃ، جو اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیدان درنمی آید، سواراں را چہ شد؟[1]

ہرچند سلامتی در زاویہ است اما دولت عز و شہادت در معرکہ است، کنج درزاویہ باہل سرو ضعف مناسب است ۔ ۔ در حدیث آمدہ : اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ ۔ کار مردان اقویا مبارزت و معرکہ کبریٰ است ۔
قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا
(مکتوب ۵۶ دفتر سوم ص۱۲۸)

ہم زاویہ نشینان، ضعیفان بجز دعا اور کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ جو دلوں کا حال جانتا ہے اپنے دین کو سربلند فرمائے (آمین)

والسّلام
عاجز حمید فضلی

لہ (ترجمہ) توفیق و سعادت کی گیند درمیان میں انہوں نے پھینک دی ہے۔ لیکن میدان میں کوئی نہیں آتا، سواروں کو کیا ہوگیا!
باوجودیکہ سلامتی دامن خانقاہ کی تنہائی میں ہے لیکن عزّتِ اُخروی اور شہادت کی دولت معرکۂ کارزار میں ہے۔ خانقاہ اور تنہائی کمزور لوگوں کے لیے تو شاید مناسب ہو (لیکن مَردانِ حُر کے لیے مناسب نہیں) حدیث میں آیا ہے کہ "قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے" (اس لیے) قوی مَردوں کا کام باطل کو للکارنا اور میدان کارزار میں خم ٹھونک کر آنا ہے (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے)
"اے نبیؐ فرما دیں کہ ہر شخص کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ اور طریقے پر" (لیکن) تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک راستہ کی رہنمائی کس کو میسر آئی ہے! (بنی اسرائیل آیت ۸۴)

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار
میثاق
فی شمارہ تین روپے ـــ سالانہ زرِتعاون تیس روپے
قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں یا ہم سے طلب فرمائیں
مکتبہ تنظیم اسلامی ـــ ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون نمبر ۸۵۲۶۱۱

ہر دانہ منتخب
فریش ویل
بادام اور پستہ
تلے ہوئے - تازہ
مصالحے دار - ذائقے دار
نمکینیت کے تیتے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ
Freshwel
Freshwel
ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔
اے - کے - ایچ - ایم (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-۱۱۳، سائٹ، کراچی - فون: ۹۵-۲۹۴۲۹۱

اَلاِمَامُ المَھدِیؑ

مولانا اختر کاشمیری کی زیرِ طبع کتاب پر تقریظ

از قلم: اسرار احمد

جس طرح "شرک فی الصفات" کے ضمن میں مغالطے کا اصل سبب لفظی اشتراک ہے یعنی یہ کہ صفات باری تعالیٰ کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہی مخلوق کے لئے بھی مستعمل ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ عالم و علیم ہے اور انسان بھی نہ صرف عالم و علیم بلکہ علامہ تک ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ حقیقت پیشِ نظر نہ رہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا وجود ذاتی ہے نہ کہ عطائی، قدیم ہے نہ کہ حادث اور لامحدود و لامتناہی ہے نہ کہ محدود و مقیّد، اسی طرح اس کی جملہ صفات بھی ذاتی، قدیم اور مطلق ہیں جبکہ مخلوقات کا وجود اور ان کی جملہ صفات بھی عطائی ہیں نہ کہ ذاتی، حادث ہیں نہ کہ قدیم اور محدود ہیں نہ کہ مطلق، تو انسان نادانستہ مغالطہ کا شکار ہو سکتا ہے۔

اسی طرح چند عظیم شخصیتوں کے ضمن میں بھی نام کا اشتراک کچھ غیر شعوری طور پر مغالطوں کا سبب بنا ہے اور کچھ لوگوں نے اسے دانستہ طور پر گمراہی پھیلانے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں!!

مثلاً عیسیٰ بن مریم نام کی دو شخصیتیں ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں یعنی ایک وہ یسوع مسیح جن کو عیسائی مانتے ہیں جو یا تو خدا کا اوتار (GOD - INCARNATE) ہیں یا کم از کم الوہیت کی اقانیم ثلاثہ میں سے ایک فرد ہیں، جنہوں نے اپنے ماننے والوں کے جملہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے سولی پر تڑپ تڑپ کر اور نالہ و شیون کے ساتھ جان دی اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے اور اب ان کا نزول صرف اپنی ذاتی شان و شوکت اور اپنے مقام و مرتبہ کے اظہار کے لئے قیامت کے موقع پر ہوگا۔

جبکہ دوسرے عیسیٰ وہ ہیں جنہیں ہم مسلمان مانتے ہیں۔ جو اگرچہ پیدا تو بن باپ ہی کے ہوئے تھے لیکن نہ خدا کا اوتار ہیں نہ الوہیت میں کسی حصے کے حامل بلکہ خدا کے بندے اور بنی اسرائیل کی جانب اس کے رسول ہیں جو نہ مغلوب ہوئے نہ مصلوب بلکہ زندہ ہی آسمان پر اٹھا لئے گئے ــــــ اور قیامت کے قریب آسمان سے اس وقت نازل ہوں گے جبکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین

ایک فیصلہ کن معرکہ گرم ہوگا جس میں وہ مسلمانوں کی مدد کریں گے اور یہودیوں کا قلع قمع کریں گے اور یہودیوں کے لیڈر دجّال اکبر کو قتل کریں گے اور مسلمانوں کے اس وقت کے قائد و سپہ سالار کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے اور پھر ان کی طبعی موت واقع ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہی نہیں متضاد ہیں اور ان میں ایک نام کے سوا صرف بن باپ کی ولادت اور زندہ آسمان پر اٹھایا جانا مشترک ہیں باقی جملہ اوصاف میں وہ ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔

یہی معاملہ علیؓ بن ابی طالب کا ہے ـــــ چنانچہ علیؓ وہ ہیں جنہیں اہل تشیع مانتے ہیں جو ایک جانب الوہیت کا مظہر اتم ہیں دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور خلیفہ بلافصل ہیں اور تیسری جانب امام معصوم ہیں، جن کا قرآن امت کے متفق علیہ قرآن سے جدا ہے، جنہوں نے خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت کو محض بربنائے تقیہ قبول اور برداشت کیا۔ درنفس الحقیقت وہ انہیں غاصب اور منافق سمجھتے تھے ـــــ وغیر ذالک من الھفوات!

اور دوسرے علیؓ وہ ہیں جنہیں اہل سنت والجماعت مانتے ہیں جو نہ الوہیت کا مظہر ہیں نہ وصی رسولؐ اور نہ امام معصوم، بلکہ صرف جلیل القدر صحابی ہیں۔ البتہ جملہ صحابہ میں صرف تین کے سوا سب سے افضل ہیں، اسی طرح وہ خلیفۂ راشد ہیں اور تینوں سابق خلفائے راشدین کے بعد خلیفہ رابع!

ان کے بارے میں یہ تصور ہی ناقابل قبول ہے کہ وہ کسی طرح خوف یا مصلحت کی بنا پر منافقوں اور غاصبوں کے ساتھ مصالحت بلکہ تعاون کر سکتے تھے۔

الغرض یہ دونوں شخصیتیں بھی ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں اور ان کے نام اور ولدیت اور نبی اکرم علیہ السلام کے داماد ہونے، حضرت فاطمہؓ کے شوہر اور حضرات حسنینؓ کے والد ماجد ہونے کے سوا ان میں کوئی اور وصف مشترک نہیں ہے۔

یہی معاملہ مہدیؑ کا ہے ـــــ کہ ایک ہیں اہل تشیع کے "الامام المہدی" جو بارہویں امام معصوم ہیں۔ چنانچہ ۸۷۳ء میں گیارہویں امام معصوم حضرت حسن عسکری کے یہاں پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی روپوش ہو گئے یا کر دیئے گئے۔ ابتداءً ان کی غیبوبت صغریٰ تھی جس کے دوران ان سے کچھ لوگ ہدایات حاصل کرتے رہے اور بعد ازاں وہ غیبوبت کبریٰ میں داخل ہو گئے اور باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ بالکل منقطع ہو گیا۔ چنانچہ اب ان کا انتظار ہے ـــــ وہ قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے اور پوری دنیا پر اسلام غالب کریں گے۔ جبکہ اہل سنت بعض احادیث نبویہ کی رو سے جس مہدی کے قائل ہیں وہ نہ امام معصوم ہیں نہ ۸۷۳ء سے تاحال روپوش و غائب ہیں بلکہ قیامت

کے قریب کے زمانے میں عام انسانوں کی طرح پیدا ہوں گے۔ اگرچہ وہ ہوں گے سیدہ فاطمہؓ ہی کی نسل سے، اور ان کا اپنا نام آنحضورؐ کے نام پر اور ان کے والدین کا نام آپؐ کے والدین کے نام پر ہوگا۔ قیامت کے قریب کے زمانے میں یہی مسلمانوں کے قائد و سپہ سالار ہوں گے۔ ان کی سرکردگی میں ہی یہود سے معرکہ برپا ہوگا۔ جب حضرت مسیحؑ کا نزول ہوگا جو ان ہی کی امامت میں نماز ادا فرمائیں گے۔ اور ان کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے کفار یہود کا قلع قمع اور ان کے لیڈر دجّال اکبر کو واصلِ جہنم کریں گے۔

لیکن جس طرح ناواقف مسلمان عوام میں اپنی تبلیغ کے ضمن میں مسیحی مبشرین نے عیسیٰؑ کے نام کے اشتراک سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بہت سوں کو گمراہ کر دیا اسی طرح روافض نے بھی ناموں کے اشتراک سے غلط فائدہ اٹھایا اور اہلِ سنّت کے غافل عوام کو مغالطوں میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ایک جانب حضرت علیؓ سے ان کی طبعی اور دینی محبت و عقیدت کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا تو دوسری جانب مہدی کی شخصیت کے بارے میں اہلِ سنّت کے ذخیرہ احادیث میں وارد شدہ روایات کی بناء پر اپنے مزعومہ امام غائب کے وجود کو منوانے کی کوشش کی

اس کا ایک علاج تو وہی ہے جو اہلِ سنّت کے جمہور علماء تا حال کرتے آرہے ہیں یعنی یہ کہ ناموں کے اشتراک کے مغالطے کو رفع کر کے حقیقتِ حال کو واضح کرنے کی دیانت دارانہ امکانی کوشش بلالحاظ اس کے کہ جڑ کٹتی ہے یا نہیں اور مغالطے رفع ہوتے ہیں یا نہیں!

اور ایک راہ وہ ہے جس کی نشاندہی پیشِ نظر تالیف میں کی ہے ایک نوجوان صحافی اور عالمِ دین جناب اختر کاشمیری نے۔ اس پر اہلِ تشیع کا ردِّ عمل تو خارج از بحث ہے۔ اس لئے کہ وہ کتاب کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ البتہ اہلِ سنّت کے علماء کا ردِّ عمل بھی ناقابلِ فہم نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک تو بات نئی ہے جس پر غور کرنے کے لئے آمادگی پیدا ہوتے ہوتے ہی ہوتی ہے اور دوسرے اختر صاحب کا اندازِ تحریر بھی نہ صرف یہ کہ ان کی نوجوانی کی بھرپور غمازی کر رہا ہے بلکہ ان کے صحافیانہ مشاغل کی بھی کامل عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا علماء کرام کا تشویش فطری ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک اس معاملے میں ایک اصولی بات ان کی جانب سے ایسی آئی ہے جس پر علماء اہلِ سنّت کو ان کے اندازِ تحریر کے تیکھے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے پوری توجہ کرنی چاہئے۔ اور وہ ہے یہ اصول کہ اس نوع کی احادیث کے سلسلہ روایت میں اگر کوئی رافضی یا شیعہ راوی بھی آتا ہو تو اس کے ردّ و قبول کے معاملے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں یہ دلیل کہ اگر ہمارے اسلاف نے بعض روافض کے رفض کے علم کے باوجود

ان کی سیرت و کردار کے دوسرے پہلوؤں کے قابلِ اعتماد ہونے کی بنا پر ان کی روایت قبول کی ہے تو ہم اس میں کیسے ترمیم کر سکتے ہیں، بظاہر بہت قوی ہے لیکن اس کے مقابلے میں اتنی ہی قابلِ لحاظ دلیل یہ بھی ہے کہ جیسے ماضی قریب میں مولانا عبدالشکور لکھنوی اور حال میں مولانا محمد منظور نعمانی نے نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ ہمارے اسلاف تک روافض کی جملہ کتابیں نہیں پہنچ پائیں۔ اور اس بنا پر ان کا رویہ ان کے حق میں نرم رہا۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ روافض کے اصولِ تقیہ پر بھی کماحقہٗ مطلع نہ ہو پائے ہوں ـــــ اور اسی بنا پر ان کی روایات کو قبول کر لیا گیا ہو!

بہرحال اس مسئلے میں از سرِ نو تحقیق کا حق ادا کیا جانا ضروری ہے اور اہلِ علم سے درخواست ہے کہ وہ مؤلف کے اندازِ بیان سے صرفِ نظر ہی نہیں "غضِّ بصر" کرتے ہوئے ان کے دلائل پر غور فرمائیں اور اس ضمن میں خالص علمی انداز میں مسئلے کی از سرِ نو تحقیق کرتے ہوئے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ سرانجام دیں۔

بقیہ : ایک اہم خط

تمام خواص و عوام مطلع رہیں کہ میں آئندہ اس حدیث شریف پر عمل کی کوشش کروں گا۔ کسی ایسی مجلس تقریب اور دعوت میں شریک نہ ہوں گا جس میں کوئی ایک شخص بھی منکر شرعی کا مرتکب ہو۔ نیز لڑکیوں کی دعوت نکاح اور ایسی دعوتِ ولیمہ جس میں مطبوعہ مزخرفہ مروّجہ دعوت نامے بھیجے گئے ہوں شریک نہ ہوں گا۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

عقائدِ آخرت

آخرت ایک جامع لفظ ہے۔ جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں سب ذیل عقائد شامل ہیں:

۱۔ یہ کہ انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

۲۔ یہ کہ دنیا کا نظام ابدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر جسے صرف خدا ہی جانتا ہے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۳۔ یہ کہ اس عالم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

۴۔ یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بدٹھہریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

ایک اہم خط اور تعلیم نبویؐ کا اہم موتی

مرسلہ : مولانا محی الدّین لکھوی (دیپالپور)

۲۶ رجمادی الثانی ۱۴۰۶ھ

من محی الدّین اللکھوی

الی الاخ العزیز امیر تنظیم اسلامی دکتور اسرار احمد

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ امابعد :۔

فقال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم "الدّین النّصیحۃ"
قیل "لمن یارسول اللہ ؟" قال "للہ والکتابہ والرّسولہ
ولائمۃ المسلمین وعامتھم"

نصف سال سے زیادہ عرصہ ہُوا جبکہ راقم نے ایک حدیث شریف زیرِ عنوان "دعوتِ عمل" فوٹو سیٹ کروائی تھی لیکن وہ میری طبعی پریشانی اور نسیان کا شکار رہی۔ آج توفیق شاملِ حال ہوئی تو وہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ آپ مناسب سمجھیں تو میثاق یا حکمت میں شائع کروادیں۔

میری بیعت والد رحمۃ اللہ علیہ سے تھی اور اُن کی امیر مجاہدین فضل الٰہیؒ سے نیز والد صاحب کا مجھے حکم تھا کہ عوام کی بیعت کرو۔ چنانچہ تحصیلِ علم کے بعد سے ہی سلسلۂ بیعت شروع ہُوا جو اب تک جاری ہے۔ گویا میں بھی ایک بے نام کی گمنام جماعت کا امیر ہوں۔ میرا بھی کتاب وسنّت کی روشنی میں طریق کار ہے جو میرے ساتھی جانتے ہیں۔ رات دن کی مصروفیت ہے۔ صحافت میں آج تک معتدبہ حصّہ نہیں لیا۔ تاہم اپنی مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ تاہم آپ یہ نوٹ فرمائیں کہ سو فیصد آپ کی تحریک سے متفق ہوں۔

لجسمی ھٰھنا قلبی لدیکم

راقم نے ایک عرصہ سے سفر قطعاً بند کر دیا ہے۔ گذشتہ عمر سفر ہی میں بسر ہوگئی

اب خیال ہے کہ اشد ضرورت کے علاوہ عام سفر ترک کروں اور گھر پر مقیم رہ کر خدمت دین کروں۔

اللہ تعالےٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے اور صراطِ مستقیم پر چلائے۔ (آمین)
تمام ساتھیوں کی خدمت میں سلام عرض کریں۔

حدیثِ نبویؐ

سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تنبیہہ،

مشکوٰۃ شریف باب الامر بالمعروف ص۴۳۸ پر بروایت ترمذی وابوداؤد رفوع حدیث ہے۔ عبداللہ بن مسعود رض راوی ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو اُن کے علماء نے انہیں روکا لیکن وہ باز نہ آئے۔ پھر وہی علماء اُن کی مجالس میں بیٹھنے لگے اور اُن سے مِل جُل کر کھاتے پیتے رہے۔ تو اللہ تعالےٰ نے اُن کے دل آپس میں ملا دیئے، پھر اُن پر لعنت کردی۔ (داؤد و عیسےٰ بن مریم کی زبان پر (علی نبیّنا وعلیہما السلام) ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (یہ لعنت اُن کی نافرمانی اور زیادتی کی وجہ سے ہوئی) راوی نے کہا کہ حضورؐ تکیہ لگائے ہوئے تھے پھر سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور فرمایا "قسم اِس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ امر بالمعروف کرو یہاں تک کہ انہیں حق کی جانب موڑ دو" اور ایک روایت میں ہے۔ ہرگز نہیں! اللہ کی قسم تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، اور ظالم کے ہاتھ پکڑ لو اور حق قبول کرنے پر انہیں مجبور کردو۔ ورنہ اللہ تعالےٰ تمہارے دل ایک جیسے کردے گا پھر تم پر لعنت کردے گا۔ جس طرح اُن پر لعنت کی۔

شارح لکھتا ہے اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو تم اُن کے ساتھ میل جول گفتگو۔ کھانا پینا اور مجلس ترک کرو۔

اِس حدیث شریف کی رو سے ہر مسلمان یگانہ و بیگانہ صاحبِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی گناہ کے مرتکب کے ساتھ اگر وہ باز نہ آئے میل جول نہ رکھے ورنہ عین ممکن ہے کہ اِس کا دِل بھی متاثر ہو اور آہستہ آہستہ دِل سے گناہ کی نفرت نکل جائے۔ جو بالآخر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا موجب ہوگی۔ معاذ اللہ۔

(باقی ص۱۰۸ پر)

Coca-Cola is it!
TRADE MARK REGD.

معراج النبی

علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک اہم خطاب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
جس میں موصوف نے اس محیّر العقل واقعہ کو قرآن مجید اور
احادیث شریف نیز عقلی استدلال سے واضح و مبرہن کیا ہے

عمدہ آفسٹ پیپر۔ اعلیٰ طباعت۔ صفحات ۴۰
قیمت ـــــ فی نسخہ تین روپے ـــــ (علاوہ محصول ڈاک)
ـــــ ملنے کا پتہ ـــــ

(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴
(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ

ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پُروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے۔ ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب سے بڑے برآمد کنندگان ہونے کا بجا طور پر شرف حاصل ہے۔

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ

SNDS

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمد کنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور (پاکستان)

فون: ۳۰۶۴۶۸-۳۰۵۴۶۹، تار: شاہی خیمہ ٹیلکس: 44543 NOOR PK

ایکسپورٹ آفس: ۶۱۶-۶۱۴۰ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ۔ کراچی (پاکستان)

فون: ۲۱۳۵۴۰-۲۱۴۳۸۷، تار: 'TARPAULIN' ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 35	APRIL 1986	No. 4

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO EVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEFHONE : 870512 880731